डा० राम मनोहर लोहिया

अवध विश्वविद्यालय

تحقیقی مقالہ (برائے ڈگری آف فلاسفی)

"۱۹۷۰ء کے بعد جدید نظم کا مطالعہ"

زیر نگرانی

جناب ڈاکٹر سیّد طارق سعید صاحب ریڈر و صدر شعبۂ اردو
(ساکیت پی۔ جی۔ کالج اودھ یونیورسٹی فیض آباد)

از

(تسنیم فاطمہ)

ماہ دسمبر ۲۰۰۲ء

ساکیت۔ پی۔ جی۔ کالج فیض آباد

ڈاکٹر رام منوہر لھویا

اودھ یونیورسٹی فیض آباد

TARIQ SAEED
M.A.,Ph.D.(Alig.)
Researc-Guide(Urdu)
Avadh Undiversity
Faizabad

645, Urdu Bagh
Old Subzi Mandi
Faizabad-224001
Ph.N. 221033

This is to certify that Ms. **Tasneem Fatima** *has completed hes thesis entitled,* **1970 KE BAD JADID - NAZM KA MUTALEA** *under my supervision.*

To the best of my knowledge, it is fit for submission for the award of Degree of philosophy in Urdu.

(Dr. Tariq Saeed)
(साहित्य रत्न)
Reader & Head Urdu Dept.
K.S. Saket P.G. College, Faizabad
Convenor, Board of Studies (Urdu)
Dr. R.M.L. Avadh Univesity
Faizabad
Reserch Guide
Deptt. of Urdu Saket P.G. College
University of Avadh, Faizabad

۷۸۶

ترتیب

پیش لفظ

زمانہ تیزی سے متغیر ہے، سکون وثبات ہر لحظہ متحرک ہے اور نت نئی اختراعات وایجادات سے خود تجربہ متحیر ہے۔ انکشافات انسانی کی روز افزوں ترقی نے چہار جانب اپنے اثر ونفوذ کو مرتسم کر رکھا ہے۔ ادب اور اس کی جمالیات اس کلونی عصر سے اچھوتی کیسے رہ سکتی ہے؟ اباحیت اور مساکیت کا دور دورہ ہے۔ 'جنس گراں' جنس بے مایہ ہے اور انسانی قدروں کا زیاں ترقی پر ہے۔ ان حالات میں ادبی منظر نامہ، بے قدری کے نوحے کیوں کر ثبت کر سکتا ہے؟ انساں پر انسان کی خدائی کا جبر ہے غلامی فکر وفن پر عامی نازاں ہیں اور ظلمت ابلیس کا رقص شروع ہو چکا ہے۔ اس عالم میں حسن قلم کی کرشمہ سازیاں حسن ازل کے نئے نغمہ سنج ہوں ،حریت کی پاسبان ہوں اور تقصیر وقت کی خدائی سے نبرد آزماں ہوں تو بلا شبہ ماوریٰ کے تعقل متصور کیا جائیگا اور ایسے ادبی تجربہ کی تحقیق وتنقید بھی لازمی قرار پائے گی۔ اسی ادبی تنقیح کے تناظر میں ۱۹۷۰ء کے بعد'' جدید نظم کا مطالعہ'' کے موضوع سے یہ تحقیق مقالہ سپرد قلم کیا جارہا ہے گزشتہ تین دھائیوں میں جدید نظم کے میلانات بدلتے رجحانات تمدنی زوال وارتقاء اور ان کے اسباب' ابھرتے ڈوبتے ہوئے جدید شعراء کی حوصلہ افزائی اور حوصلہ شکنی اور نئی تخلیقات کی اشاعت وغیرہ کو سامنے رکھئے اور جدید نظم میں معروضی اور غیر معروضی شعریت کے ساتھ متعدد قاری کی غیر تسلی بخش فہم کو دوسری جانب رکھئے تو یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ جدیدیت کے بعض حامی شعراء جدید نظم کی تخلیق سنجیدگی سے نہیں بلکہ فیشن کے زیر اثر کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ ان میں سے چند فنکار ایسے بھی ہیں جو وقیع رسائل کی زینت تو بنے لیکن ادب کی زینت نہ بن سکے اردو نظم کی اس مجموعی صورت حال کا غیر جانبدارانہ اور تحقیقی مقالہ ہنوز باقی ہے' ایسا بھی نہیں ہے کہ جدید نظم کی معروضی تنقید ناپید ہے لیکن چند بکھرے مضامین کے توسط سے یا بعض رسائل کی خصوصی اشاعتوں سے یا بعض فلسفیانہ کتابوں کی بازگشتوں سے اس عہد کی آگہی کو مکمل طور پر مقید کرنا' بلا شبہ ایک مشکل ادبی تجربہ ہے اسی ادبی تجربہ کی تحقیق وتنقید اس مقالہ کی تقدیر ہے۔

اس مقالہ میں نظم کی تاریخی اور تہذیبی قدروں کو شعری نظریات کی بنیاد قرار دیا گیا ہے نیز ان قدروں کے توسط سے مخصوص عہد کے شعراء وشاعرات کے شعری نظریات کا تجزیہ ان کی تخلیقات کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل

ہے اور ہر باب کے مزید ذیلی ابواب قائم ہیں جو موضوع کے تمام جہات کو اسیر کرتے ہین یہ تقسیم صرف قلم ونظر کی خاطر بروئے کار نہیں لائی گئی بلکہ مطالعہ کی منطق اس تقسیم کی متقاضی تھی۔

باب اول جو پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے اس میں جدید ترین نظم کی شعریات کے حوالے سے حالی تا میرا جی اور میرا جی تا کیفی اعظمی جیسے فنکاروں کی فنی بصیرت اور تخلیقی سریت پر محیط ہے دراصل جدیدیت کے بانی یہی حضرات تھے اور یہیں سے جدید نظم میں تغیر اور تبدل کی فضا بنی شروع ہوئی یہی جدید نظم کا نشان آغاز تھا۔

دوسرا باب جدید نظم کی معروف شعری اقدار پر مشتمل ہے ذیلی ابواب میں ان اقدار کے ردعمل کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم شعری جمالیات، تعین قدر کے مسائل اور روایات سے انحراف پر مشتمل ہے شاعر کو نئے تجربوں کے بدلے کن خمیازوں کا سامنا کرنا پڑا اور نئے موضوعات کی جستجو نے اسے انعام واکرام کی کتنی منزلیں عطا کیں ان سب نکات کا احاطہ اس باب میں کیا گیا ہے۔

باب چہارم کے تحت حیات انسانی کے منجملہ اعمال و افعال کا جائزہ جدید ترین فنکارون کے نظریۂ وعمل کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے حتی الامکان مثالوں اور ادبی منظر ناموں کے ذریعہ حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ اس باب کی نوعیت کو تحقیقی بنادیتی ہے۔

پانچویں اور آخری باب میں اس مقالے کے اہم ترین پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی، یہ باب موضوع کے اعتبار سے مقتضائے تحقیق ہے باب دوم تا چہارم تمام مطالعے اور تجزئے اس خیال کے غماز ہیں کہ وہ جدید نظم کی توسیع، تشریح اور تعبیر میں کہاں تک کامیاب ہیں۔

اردو نظم نگاری کے دو بنیادی مسائل ہیں موضوعات اور فنی طریق، فنی طریق کار کے اندر تشبیہات، استعارے، علامات و پیکر وغیرہ کا جواز مضمر ہے جدیدیت کے بڑھتے ہوئے رجحان میں موضوعاتی تنوع وتغیر کس حد تک اثر پزیر ہیں یہ تجزیہ بھی شامل تحقیق ہے۔ مختلف شعراء کا کلام مختلف مثالیں، انواع واقسام افکار، مخصوص رجحانات اور ادبی رویہ ایک ایک

عنصر کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ فنکاروں کی منفرد خصوصیات پر تبصرہ الگ سے قلم بند کیا گیا ہے جو اس مقالہ کو مزید مشکل کرنا ہے لیکن یہ امر روشن ہے کہ ایک شاعر آج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے یہی اختلاف ان کے مقام کو تعین کرنا ہے اس نکتہ کے پیش نظر نامور شعراء کی شخصیت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اس میں اکثر شعراء کی ساری نظمیں قابل جائزہ ہیں اور یکساں اہمیت کی حامل ہیں ان سب کا مطالعہ کئے بغیر دور مخصوص کے تنوع کا مکمل جائزہ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ان نقطہ نظر کو بھی خاطر نشاں رکھا گیا کہ اس تحقیق کا موضوع جدید شعراء کی فہرست سازی نہیں بلکہ جدید فکری فنی جہتوں کی نشاندہی ہے اس لئے تمام فنکاروں کا تحقیق میں شامل ہونا کار محال تھا باوجود اس کے صدق دل معذرت کی خواہاں ہوں۔

ان کاوشوں کی تکمیل میں میرے والدین کا سایہء عاطفت میرے لئے سامان گراں مایہ ہے ان کی دعاؤں کا اثر ہے کہ آج میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے یہ تحقیقی مقالہ پیش کر رہی ہوں میری ناسپاسی ہوگی کہ اگر اس موقع پر اس تھیسس کے نگراں محترم ڈاکٹر طارق سعید صاحب صدر شعبۂ اردو ساکیت پی۔ جی۔ کالج فیض آباد کی اصلاح اور حوصلہ افزائی کو نہ بیان کروں ان کے مخلصانہ مشوروں اور رہنمائی کی میں ہمیشہ ممنون رہوں گی۔

ساتھ ہی جناب محمد محسن نقوی دانش (ایف۔ ایس۔ کمپیوٹرس فیض آبا) کی شکر گزار ہوں جنھوں نے رکاڈ ٹائم میں اس تحقیق کو حسن نستعلیق کے زیور سے آراستہ کیا علاوہ ازیں اپنے تمام محسنوں، تحقیق میں شامل ففکاروں اور قلمکاروں کی مشکور ہوں کہ بلا شبہ ان کی غیر موجودگی میں اس تحقیقی مقالے کی تکمیل ناممکن تھی۔

تسنیم فاطمہ
لیکچرر و ہیڈ شعبۂ اردو
ردولی ڈگری کالج ردولی، فیض آباد
دسمبر ۲۰۰۲ء

باب اوّل

(۱)

تقسیم ہند کے خونی واقعات میں ڈوب کر جب نئی نسل ابھری تو مذہب اور انسانیت سے اسکا اعتبار متزلزل ہو چکا تھا ہندوستانی معاشرے کی آلودہ فضا میں اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا ایسے حالات میں وہ متلاشی ہوئی ایک ایسے معاشرے ایسی فضا اور ایسے ماحول کی جوانسانیت کی ان تمام پراگندیوں سے پاک ہو چنانچہ اس نے اخلاقی اقدار کی پستی کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ اسکواپنی زندگی کا ایک حصہ بنالیا آہستہ آہستہ اس کے خیالات اور تجربات میں جوتغیرات آ رہے وہ معمولی نہ تھے نظریات وعقائد کے ساتھ ان کے نصب العین اور مقاصد بھی متغیر ہوتے گئے مگر کسی جدید روش یا طے شدہ راہ کو ہموار کرنا اور اس پر چل نکلنا بہت ہی دشوار تھا نئی راہوں پر درپیش مراحل اسکو ہراساں کے ہوتے تھے اسے عوام کی نکتہ چینیوں کا اندیشہ بھی تھا اور نئی تحریک کی شکستگی کا خوف بھی۔

ہمارے شعراء کا یہ بھی خیال تھا کہ کسی جدید تحریک میں شکست کا سامنا اگر کرنا پڑے تو تنہا نہیں بلکہ اسکا سامنا کرنے کیلئے اسکے پس وپیش اسکے ہمنوا بھی ہوں چنانچہ حلقہ ارباب ذوق کے ذریعہ جلائی گئی مشعل کی نئی روشنی نے رہنمائی کی اور پے در پے جدیدیت کوفروغ دینے کیلئے مختلف تنظمیں اور تحریکیں وجود میں آئیں جنکے رجحانات ومیلانات جدید شاعری کی جانب تھے اور جدید نظریہ کے حامی شعراء بلا کسی مقصد ایک ہی لب ولہجہ اور ایک ہی انداز فکر کے ساتھ اپنے خیالات پیش کرنے لگے۔

کوثر خطیری صاحب نے انھیں یوں مخاطب کیا۔

'' ارے سر پھرے' کورے بے عقل وناداں
نشاں تری منزل کے سب مٹ چکے ہیں
تو افتاں وخیزاں کہاں جارہا ہے
یہ کیا گارہا ہے ؟
اچھل کر زمیں پر زمیں سے اچھل کر

(۲)

سوئے آسماں اس طرح جست کیا ہے؟
زمیں پر بھی ٹھوکر فلک کو بھی چیر دینے پہ مائل
تو کیا سوچتا ہے کہ تیری یہ قوت
جو نزلہ کی زد میں بھی دم توڑ دیتی ہے اکثر
زمیں چیر دے گی
ارے سر پھرے' کورے کیا سوچتا ہے؟''[۱]

دراصل جدید شاعری اپنے گرد و پیش بندشوں اور ضوابط کی تحریر سے آزادی چاہتی ہے۔ اسکا نہ کوئی قائد ہوتا ہے نہ کوئی دستورالعمل منظر اعظمی کے مندرجہ خیال سے جدیدیت کا واضح نقش ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

'' نئی شاعری تحریک نہیں ہے اس سے اسکا کوئی دستورالعمل نہیں کوئی قائدہ نہیں اور کوئی لگا بندھا نظریہ اور لائحہ کار بھی نہیں یہ تو ایک ایسا ذہنی رویہ طرز احساس اور جدیدیت کی ایسی رو ہے جو کسی تقلید کسی اصول اور ضابطے کی قائل نہیں ہے ایک آزادانہ احساس کا آزادانہ اظہار ہے انحراف وانقطاع کی ایک روش ہے جس کو جدید حیثیت Modern Sensibility کا نام دیا جاسکتا ہے۔''[۱]

جدید شاعری کے بارے میں ڈاکٹر شمیم حنفی کا نظریہ بھی قابل مطالعہ ہے:-
'' نئی شاعری ان دونوں (یعنی ۱۹ویں صدی کی جدید شاعری

---

[۱] ولاتمش فی الارض مدحا۔ افکار ملیکو ثر خطیری [۱] اردو ادب کی ارتقاء میں ''ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ'' منظر اعظمی

اور بیسویں صدی کی ترقی پسند تحریک کے برعکس نہ تو کوئی
ٹھوس اور واضح مقصد رکھتی ہے نہ جدیدیت کوئی ایسا دستور العمل
فراہم کرتی ہے جس سے مکمل وابستگی شعری حلقہ میں مشمولیت
کی ضامن سمجھی جائے فکری سطح پر جدیدیت کا منظرنامہ ایسا وسیع اور
بسیط ہے کہ متضاد عقائد وافکار (ذہنی اور جذباتی) دونوں کے لئے
بھی اس میں یکساں گنجائش نکل سکتی ہے اور فنی سطح پر ستھری جمالیات
.........کی اظہار و بیان کی مختلف النوع ہیتوں کی بیک وقت اس کو
سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔'' ۲

ان خیالات کے پیش نظر یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ جدید شاعری کی بنیاد انفرادی احساسات تجربات اقتضائے زمانہ اور عصری حقائق کو براہِ راست تخلیقی سطح پر پیش کرنے کی کاوشوں پر ہے اگر غور کیا جائے تو اسمیں مختلف صنعتوں کے فکری رجحانات مجتمع ہو کر جدیدیت کے ایک مربوط رجحان کی شکل میں سمجھا جاتا ہے۔

اس مختلف نوعیت کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے جدید شاعری کا بنیادی اصول مکمل آزادی ہے جدید شاعر اپنے اظہار بیان میں اس آزادی کا خوب فائدہ حاصل کرتا ہے اسی آزادی کے زیر اثر وہ نہ ہی کسی اصول وضابطہ کی پابندی کرتا ہے اور نہ ہی ردیف وقافیہ کو مدنظر رکھتا ہے اسی خیال سے متاثر ہو کر ترقی پسند نظریات جدید نظم کی محرک بنی اسی تحریک کے کچھ شعراء اشترا کی نقطہ نظر کے پیرو بھی تھے لیکن یہ نظریہ فنکار کی آزادی کا منافی تھا یہی وجہ تھی کہ جدیدیت کے خامیوں اور بانیوں میں اکثر نے ان کے نظریات سے انحراف کیا۔ جسے ۱۹۷۰ء کے بعد شعراء اور ادباء نے تسلیم کیا اس طرح جدیدت کے پیشواؤں میں ۱۹۶۰ کے ادیب وشعراء بھی شمار کئے جاتے ہیں جدیدیت کی اصطلاح کب اور کیسے وجود میں آئی ؟ یہ مسئلہ زیر غور ہے لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جس نے بھی اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے اسکے پیش

---

۲ ''ایک مضمون'' شمیم حنفی

نظر مغربی تحریک موڈرنزم ہی ہوگی یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کے متعلق بحث موڈرنزم تحریک کے زیر اثر ہی ہوتی ہے بیشتر ادیبوں نے اپنے اپنے نظریہ سے جدیدیت کی وضاحت کی لیکن کوئی بھی توضیح ایسی موجود نہیں جو مکمل طور سے جدیدیت کا محاصرہ کرتی ہو نیز ان ادباء کے مابین مختلف الرائے بھی ہیں اگر انہیں یکجا کیا جائے تو انکے اختلاف کی وجہ سے انکا ایک گروہ بن جاتا ہے جسکا یہ خیال ہے کہ جدیدیت ایک اصافی اصطلاح ہے اور یہ ہر دور میں موجود رہی ہے البتہ یہ جدت ایک دور سے دوسرے دور میں ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے تک مختلف ہوتی رہی ہے آل احمد سرور جدیدیت کو ایک اضافی اصطلاح قرار دیتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں۔

> '' جدیدیت ایک اضافی چیز ہے یہ مطلق کہیں نہیں ہے ماضی میں بھی ایسے لوگ ہوئے ہیں جو آج بھی جدید معلوم ہوتے ہیں آج بھی ایسے لوگ ہیں جو ماضی کے قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور آج کے زمانے میں رہتے ہوئے پرانے ذہنوں کے آئنہ دار ہیں'' [۳]

ن م راشد بھی سرور صاحب کے ہم خیال ہیں جدیدیت کے متعلق ان کا نظریہ بھی قابل مطالع ہے لکھتے ہیں :-

> '' جدید شاعری وہی ہے جو جدید شعر کہتا ہو صرف اس نوع کے شعر کہتا ہو جس پر قدامت یا روایت کی مہر ثبت نہ ہو ہر نظریہ سے جدید انداز کے حامل ہوں جن کے اندر کسی خیال یا مصنوی زندگی کی ترجمانی کے بجائے جیتی جاگتی ہمارے آپ کے گرد کی دنیا کی ترجمانی کی گئی ہو..................کسی طرح قاری کے حسب توقع نہ ہو بلکہ قاری کیلئے غیر متوقع اور اجنبی ہو۔'' [۴]

---

۳ ''اردو ادب میں جدیدیت کا مفہوم'' ص ۸۱ ''جدیدیت اور ادب'' آل احمد سرور

۴ ''جدیدیت کیا ہے'' ص ۲۰۹-۲۱۰ ''شخصیت اور فن'' ن م راشد

راشدؔ کا خیال ہے کہ فنکار کے احساسات وخیالات کے ساتھ ساتھ اسکے طرز اظہار میں وہ ندرت ورفعت ہونی چاہئے جہاں تک قاری کا گماں بھی نہ پہنچ سکے جواسکو متحیر نہ کر سکے توکم ازکم متوجہ کرہی لے۔

مندرجہ اقتباسات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ زندگی کی ارتقاء میں کوئی بھی شئے حائل نہیں ہوسکتی زندگی اپنے مخصوص انداز سے مائل بہ ارتقاء ہے اور وہ طریق عمل جوزندگی کو ترقی کی جانب لئے جارہا ہے وہ جدیدیت ہی ہے۔

اس جدیدیت کی تلاش میں سرسیدؔ، حالیؔ، اقبالؔ، اور دیگر شعراء وادباء کی فکری اورفنی بصیرتوں سے بعد کے فنکاروں نے ترقی پسند عناصر کی بازیافت کی اور ایک خاص اکثریت ترقی پسند ادب کے ساتھ ہو

چلی۔ یہ فنکار قدامت پسندی اور رجعت پسندی سے گریز کرتے ہیں۔

شعراء وادباء کا دوسرا گروہ جدیدیت کی ادبی اور فکری جدت کو تسلیم کرتا ہے اس گروہ نے جدیدیت کے نظریات میں اختلاف برقرار رکھا۔ مگر اس خیال سے سبھی متفق رہے کہ جدیدیت ایک نوع کا ردعمل ہے تو دوسرے پہلو سے خالص جدید طرز احساس اور طرز فکر کا نام ہے جوتمام تر ماضی سے مختلف نہ ہوتے ہوئے بھی منفرد اور نیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اس عمل کو تصور پرستی کے خلاف ردعمل قرار دیتے ہیں:-

> '' ہندوستان میں مغربی حکومت کے بعد جب نئی تعلیم اور نئی تہذیب کا چرچہ ہوا تو ہمارے شاعروں نے تصوف اوہام پرستی مافوق الفطرت قوتوں پر یقین یا عشق رندی اور دیوانگی کے تصورات سے کنارہ کشی اختیار کر کے کچھ نئے تصورات کو جنم دیا وہ تصورات جنکا تعلق مادی زندگی فلاح بہبود اور زمانہ حال کے مسائل کا حل تلاش کرنے سے تھا'' [۵]

---

۵ ''جدید ترین غزل'' مضامین نو - ص۲۷-۷۳ خلیل الرحمٰن اعظمی

یہ استعارے شعراء کے یہاں سہارے کا کام دیتے تھے اسکے برخلاف جدیدترین شعراء کے یہاں کسی ایسے سہارے کا فقدان ہے وہ کسی صوفی مُلّا یا باغی ومجاہد کی حیثیت سے عوام کے سامنے نہیں آتا بلکہ وہ محض ایک انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جو متضاد خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیوں کا حامل بھی ہوتا ہے ان تمام کیفیات سے گزرنا ہی اسکی زندگی ہوتی ہے شمس الرحمٰن فاروقی کو بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ وہ اس شاعری کو جدید مانتے ہیں جو دور حاضر سے متاثر ہو اور اسی کی تہذیب کے ردعمل میں تخلیق ہوئی ہو انکا خیال ہے :-

''میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم خوف تنہائی کیفیت انتشار اور ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی مشینی اور میکانکی تہذیب کی لائی مادی خوشحالی ،ذہنی کھوکھلے پن، روحانی ودیوانہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے '' ۶

فاروقی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جدیدیت اور صنعتی تہذیب دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں اسی لئے وہ جدیدیت کو مخصوص زمانہ کی دین گردانتے ہیں زبیر رضوی کے شعری مجموعہ ''لہرلہر دریا بہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''جدیدیت کی اولین شرط ہے کہ شاعر اپنے عہد کی بنیادوں سے ہم آہنگ ہو وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہوئے بھی اپنے کو اس عظیم انسانی ایکائی کا ایک اہم ٹکڑا سمجھے جسے ہم کوئی بہتر وقت نہ ہونے کی وجہ سے جدید وقت کہتے ہیں۔'' ۷

باقر مہدی کے خیال کے مطابق جدیدیت ترقی پسندیت کے ردعمل کے طور پر آئی ہے

---

۶ ''نئی شاعری ایک امتحان'' لفظ ومعنی شمس الرحمٰن فاروقی ص ۱۶۶
۷ ''فاروقی کے تبصرے'' شمس الرحمٰن فاروقی ص ۶۶

اور دیگر عالمی تحریکوں سے متاثر نظر آتی ہے اس خیال کی توضیح انہیں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے : فرماتے ہیں

''جدیدیت ایک طرف اقدار کے قدیم پیمانوں کو رد کرتی ہے تو دوسری طرف ذاتی تجربہ اور جستجو کو لبیک کہتی ہے وہ انسان کو خارجی حالات سے ٹکرانے پر اس کے لئے نہیں اکساتی کہ وہ ایک جیل سے نکل کر دوسری جیل میں چلا جائے بلکہ سرکشی کو مفاہمت پر فوقیت دی ہے وہ شاعری کے رول اور شاعری کے منصب پر فخر کرتی ہے '' ۸

باقر مہدی چھوٹے چھوٹے شہری ماحول اور قصباتی فضاؤں میں پروان چڑھنے والے شعراء کو اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی ان کی تخلیقات کو قابل قدر سمجھتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ انکی تخلیقات ذاتی تجربات کے بنا پر نہیں بلکہ واقعاتی اور قصہ کہانیوں کا ماحصل ہوتی ہیں۔

بلراج کومل بھی باقر مہدی کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں وہ بھی جدیدیت کی وضاحت اسی پیرائے میں کرتے ہوئے۔

''اردو کا نیا شاعر شہروں کی پیداوار ہے اسکی زندگی کا دارومدار شہروں پر ہے اس کے محدود قارئین بھی شہروں کے باسی ہیں اس لئے پرزور خواہش کے باوجود اس سے قطعاً یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ ہندوستانی کلچر یا تہذیب کا کوئی ہمہ گیر شعری اظہار کر سکے اور ٹھیک یہی بات میں ان تمام شاعروں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں جو متوازی اور مساوی حالات میں شعر کہنے کی کوشش کر رہے ہیں چاہے وہ دوسری زبانوں کے شاعر ہی کیوں نہ ہوں'' ۹

---

۸ ''ترقی پسندی اور جدیدیت'' ''تنقیدی کشمکش'' باقر مہدی ص ۶۹
۹ ''جدید اردو نظم'' ادب کی تلاش بلراج کومل ص ۴۱

ان خیالات کی تردید کچھ حد تک یوں کی جاسکتی ہے کہ اب صنعتی اور مشینی تہذیب کا دائرہ صرف بڑے شہروں تک ہی محدود نہیں رہا بلک اسکی توسیع چھوٹے چھوٹے شہروں قصبوں اور دیہاتوں تک پہونچ گئی ہے یہاں کے شعراء بھی جدید نظریات وخیالات کے حامل ہوتے جارہے ہیں جدید مشینوں کے توسل سے وہ بھی شہروں میں آنے والے تغیراتی اثر سے مستفید ہی نہیں ہورہے ہیں بلکہ

جدید شاعر بھی شہری اور مشینری زندگی سے بیزار ہوکر کسی گاؤں کی معطر ہوا اور کھلی فضاؤں میں سانس لینا چاہتا ہے وہ شہری ہماہمی اور صنعتی ہنگاموں میں گم ہوکر نہیں بلکہ آزاد اور پرسکون ماحول سے لطف اندوزی کے ساتھ اپنی تخلیقات کو حقیقت کا پیکر بنانا چاہتا ہے اس خواہش کو نہ ہی شہری اجنبیت کا نام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی علٰحدہ پسندی کا۔ وہ نہ ہی روایات سے وابستہ رہتا ہے اور نہ ہی کسی ایسے نظریے اور عقیدے کو اپنی شاعری کا سہارا بنانا چاہتا ہے جو صرف خیالوں کی دنیا میں رہتے ہوں دراصل اسکی نفسیاتی صورت محض تخلیقی عمل تک ہی محدود ہے مجموعی طور پر جدید شاعری نے نہ صرف مشین نما شہروں اور موجودہ نظریوں کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے زبان ولہجہ اور ماحول کے اعتبار سے اقتضائے اکیسویں صدی کو پورا کیا ہے نیز انحراف وتردید کے ساتھ ساتھ روایات کا احترام اقدار کی قدر اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں رواں دواں ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور کے اس خیال سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جدیدیت میں اقتضائے زمانہ اور عصری کشمکش کی صداقت، کا جدید رنگ وآہنگ ہوتا ہے وہ تحریر کرتے ہیں۔

> ''جدیدیت صرف انسان کی تنہائی مایوسی اسکی اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں اس نے فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا ہے اس میں انسانی دوستی کا جذبہ بھی ہے مگر جدیدت کا نمایاں روپ آج

آنند (Idiology) سے بیزاری فرد پر توجہ اسکی نفسیات
کی تحقیق، ذات عرفان اسکی تنہائی اوراس کی موت
سے اسے خاص دلچسپی ہے اس کے لئے اسے شعرو
ادب کی پرانی روایات کو بدلنا پڑا ہے۔ زبان کے رائج
اصولوں سے نپٹنا پڑا ہے۔ اسے نیا رنگ وآہنگ دینا
پڑا ہے۔'' [۱۰]

عباس رضا تنویر کی نظم 'زاویئے' جدید شاعری کا ایک مکمل پیکر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

''میرے سامنے زندگی کے اور بھی زاویئے ہیں
کوئی آزمائش کی پرخار راہوں سے ہوکر گزرتا ہوا
کوئی زخم خوردہ درندے کی مانند کھسکتا ہوا
کسی موڑ پر کوئی بیٹھا ہوا گھات میں
بھیڑیے کی طرح
یہ سبھی زاویئے
اوران کے علاوہ کئی اور بھی
شاخ در شاخ
کتنی صدیوں سے اپنا توازن بنائے ہوئے
اپنے کندھوں پہ بار عظمت اٹھائے ہوئے
چشم پوشی حقیقت سے کرتے ہوئے
دم فلاح اور بہبود انساں کا بھرتے ہوئے
مانگے ہیں خراج اپنی خدمات کا
بھیک کی شکل میں'' [۱]

---

[۱۰] پروفیسر آل احمد سرور [۱] ''زاویئے'' عباس رضا تنویر

یہ نظم شاعر کے افادی نقطۂ نظر کا مظہر ہے جس کی رو سے شاعر معاشرے کا جائزہ ہی نہیں لیتا بلکہ وہ نباض بھی ہے اس نظم کے تمام زاویئے سارے معاشرے معاشرتی نظام اور حیات انسانی کا محاصرہ کرتے ہیں اور اس دور کی سیاسی جدوجہد اور عام معاشرتی صورتحال میں فرد کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس نظم کی روشنی میں یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ جدید شاعری اپنے دور کا انفرادی رجحان ہے۔ اسی دور کے ادب کے ذریعہ اس کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ ادب اپنی روایات سے قطعاً مختلف نہیں ہوتا۔ موضوعات مختلف ہوسکتے ہیں طرز احساسات میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ اظہار بیان منفرد ہوسکتا ہے۔ لیکن زبان تبدیل نہیں ہوسکتی زبان ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمام ادب کو تسلسل اور انضباط بخش سکتی ہے یہ بات دیگر ہے کہ اپنے دور کے افکار و خیالات کے تغیر کے ساتھ از خود بدلتی رہتی ہے دوسرے الفاظ میں نیا خیال یا موضوع اپنی تخلیقی زبان کا موجود ہونا ہے۔ چونکہ جدید شاعر حیات و کائنات کے متعلق مسائل اپنی ذات کے حوالے سے سمجھتا ہے وہ کسی سیاسی نظریہ یا کسی اسکول کے ضوابط کی مدد سے مسائل کو پیش کرنے کا قائل نہیں۔ اس نے نفسیات کے دبیز پردوں کو ہٹانے کیلئے علامتوں کا استعمال ناگریز سمجھا۔

جدید شاعری میں میراجی نے علامتی اور استعاراتی الفاظ پر زیادہ زور دیا وہ بذات خود ایک پراسرار شخصیت کے مالک تھے اس لئے انھوں نے علامتوں اور دیومالائی تراکیب پر زیادہ زور دیا۔ چونکہ میراجی نے اپنی زبان کو اظہار ذات کا ذریعہ بنایا تھا اسلئے انھوں نے تہہ دار اور پیچیدہ شخصیت کی نقاب کشائی کیلئے خمیدہ علامتوں اور استعاروں کا سہارا لیا۔

''ہوائیں نباتات اور آسماں پر ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوئے چند بادل
یہ سب کچھ یہ ہر شئے مرے ہی گھرانے میں آئی ہوئی ہے
زمانہ ہوں میں میرے ہی دم سے ان مٹ تسلسل کا جھولا رواں ہے
مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے یہ کیسے کہوں
کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آکر ملے ہیں''[۱]

---

[۱] میراجی

میراجی کے علاوہ منیر نیازی مجید امجد افتخار جالب احمد ہمیش وغیرہ نے بھی شاعری کی زبان میں بڑی حد تک تبدیلیاں کی ہیں ان میں کچھ حضرات زبان کی تخلیق استعمال کے سلسلے میں انتہا پسند نظر آتے ہیں اس ضمن میں افتخار جالب اور احمد ہمیش کے نام پیش کیے جا چکے ہیں یہ بیشتر علامتوں اور استعاروں کے استعمال میں بڑی حد تک انتہا پسند نظر آتے ہیں ۔ اعتدال پسند شعراء کی فہرست لمبی ہے جن میں جدید ترین نظریات کے حامل شعراء کی کثرت ہے انھوں نے نہ صرف پرانے الفاظ کو متروک کیا ہے بلکہ اگر یہ الفاظ مستعمل بھی ہوئے ہیں تو مفہوم بدل دیا گیا ہے اور یہی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ دور کے وہ الفاظ جو عقریت کو ہو بہو ظاہر کر سکیں انکو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لایا جائے ۔

'' آرزو غم امید اور محرومی کے ساتھ ساتھ
پینٹ گڑیا شمیز چوہے دان
کیلے امرود سنترے چاول
نیند کی گولیاں گلاب کے پھول [۱]

'' شب برات
آتشیں تماشوں کا سماں
اٹھا کے میری بچیوں نے ناگہاں
پچاس پیسے کے انار کے لبوں پہ ایک قطر نار رکھ دی
خاک کو یہ گرم بوسہ کب نصیب تھا! [۲]

جدید شاعری کے عبوری دور میں جن شعراء نے شہرت حاصل کی ان میں عزیز برنی وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی قاضی سلیم اور بلراج کومل وغیرہ نے جدید نظریات کو کافی وسیع اسمتی عطا کی ۔

---

[۱] '' عہد حاضر کی دلربا مخلوق '' شہریار [۲] '' شیشۂ ساعت کا غبار '' شمس الرحمٰن فاروقی

جدید شاعری کا یہ وہ فکری پس منظر اور شعراء کا مجموعی نقطۂ نظر ہے جس کی روشنی میں جدیدیت کا آغاز ہوا۔ اسکی ارتقاء میں جدید شعراء کا فکری تصور کہاں تک معاون ہے اور اس ادبی اسکول سے وابستگی نے انھیں کس حد تک کامیابی عطا کی زیرِ غور ہے۔

ادب زندگی کی دیگر ضروریات کا ایک حصہ ہے ادب کی تشکیل بھی محض ہئیت اور مزاج تک محدود نہیں بلکہ اسکے پیکر کی تراش اور مزاج کی تعمیر میں کچھ ارضی اور روحانی محرکات بہت ہی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ صنعت شعر کے بارے میں بعض بنیادی باتیں طے کرلی جائیں جب تک ہم شعر کی تعریف
اسکا تحدیدی تعین اور اسکے اثرات کا محاکمہ نہ کرلیں جدید نظم کے مزاج کو متعین کرنا یا اسکے نتائج کا ماخذ مشکل ہوگا۔ وزیر آغا کا خیال ہے۔

"شعر انھیں الفاظ سے ترتیب پاتا ہے ہے جو نثر کا سرمایہ ہے یہ کیا بات ہے کہ شعر قاری کے احساسات کو ایک پر اسرار طریق سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور نثر کی بہ نسبت کہیں زیادہ اثر آفریں ثابت ہوتا ہے ناقدین کے ایک گروہ نے اس سلسلے میں لفظ کی اہمیت سے انکار کیا ہے اصل تو شعر کی روح ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے لفظ تو محض اس روح کو قاری تک پہونچانے کا ایک وسیلہ ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اعلیٰ خیالات اور احساسات تو نثر سے بھی ادا ہوسکتے ہیں۔ لیکن شعر میں لفظوں کی ایک خاص ترتیب سے جو داخلی اور خارجی آہنگ پیدا ہوتا ہے نثر میں ممکن نہیں اور نثر کی بہ نسبت شعر کی تاثیر زیادہ ہے [۱۱]

---

۱۱ "نظم جدید کی کروٹیں" وزیر آغا ص ۱۱ - ۱۲

وزیر آغا کے دونوں ہی خیالات اپنی اپنی جگہ درست ہیں دونوں میں ہی سچائی بیان کی گئی ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ شعر میں تاثر نہ ہی اسکے روحانی وسیلہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسکی ہیئت وضاحت کے ذریعہ بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ہی ایک فنکار موثر اور مکمل نظم کو وجود بخشتا ہے۔

روایتی اردو نظموں میں ناگریزیت کا فقدان رہا ہے کیوں کہ یہ نظمیں کسی خاص موضوع کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنا چاہتی ہیں۔قدیم نظم نگاروں نے اس کو شعوری طور پر ملحوظ نہیں رکھا۔جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کسی طویل نظم کے کچھ حصے حذف کر دیئے جائیں تو مجموعی طور پر اثر انگیزی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی قدیم نظموں میں ناگریزیت کے فقدان کا سبب یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''پرانی نظموں میں ناگریزیت کا فقدان اس وجہ سے بھی تھا کہ اکثر شعراء ہیت کا قدیم تصور رکھتے تھے وہ قدیم ہیت میں نظمیں لکھتے تھے۔اگر کسی مجبوری کے سبب انھیں روایتی ہیئت سے کسی قدر انحراف بھی کرنا پڑا تو یہ انحراف بہت زیادہ انقلابی نہ تھا۔ ۱۲

اردو نظم نگاری میں انقلاب تو اس وقت برپا ہوا جب جدید شعراء کا رجحان و عمل جدت کی رو سے کچھ نیا کر دکھانے پر کمر بستہ ہوا ان کا زور غزلوں سے زیادہ نظموں پر تھا۔جدید شعراء نے نہ ہی مثنویوں اور قطعات کا سہارا لیا اور نہ ہی اصول وتحدید کو پسند کیا وہ صرف اپنی نظموں کے ذریعے فطرت کو انسانی زندگی کے قریب سے قریب تر لانا چاہتے تھے جس کے لئے انھوں نے تخیلات کے بجائے حقیقی اور سائنسی مشاہدات پر زور دیا۔تکیلات کی دنیا میں گم ہونے کے بجائے زندگی کے تلخ تجربات کو بروئے کار لانے اور جذبات وکیفیات کے بیان میں معتدل محرکات کا سہارا لیا۔اپنی شاعری کے قومی شعور کو حالات سے آہنگ کا ذریعہ بنایا فکری

---

۱۲ ''جدید اردو نظم'' نظریہ عمل ص ۱۶۸ عقیل احمد

نظریہ اور اسلوبی نکتہ نظر میں بھی انگلش اسٹائل سے استفادہ حاصل کیا۔ مثلاً حالؔی اور آزاؔد دونوں نے ہی انگریزی کے تمثیلی اور مکالماتی انداز کو اپنایا۔ یہاں تک کہ انھوں نے بیانیہ اور نشاطیہ نظموں میں اصلیت کا سہارا لیا انھیں خدشہ تھا کہ اس سہارے کے بغیر ہم حقیقت اور فطرت سے کہیں دور نکل جائیں گے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی کا خیال درست ہے فرماتے ہیں۔:

حاؔلی اور آزاؔد مغرب سے متاثر ضرور تھے مگر وہ مغرب پرست نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے بیشتر خاکے مشرقی ہی رہے جس میں انھوں نے نئے مسائل اور مغربی خیالات کو ڈھالا۔ مگر انھوں نے آئیندہ آنے والے لوگوں کے لئے نئی راہوں کی مشعلیں ضرور روشن کردیں جس سے ہئیتی تجربوں کی ہمت افزائی ہوئی۔'' ۱۳

اس طرح آزاؔد اور حاؔلی نے مغرب سے متاثر ہوکر جن تجربوں کو آزمایا متاخرین شعراء نے اسے عروج تک پہونچا دیا نثری نظم کی انتہائی صورت ظہور پزیر ہوئی اس سلسلے میں سجاد ظہیر نے '' پگھلا نیم '' کے نام سے نثری نظموں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا لیکن یہ نظمیں جدید نثری نظموں سے مختلف نظر آتی ہیں۔ مجموعے میں شامل تمام نظموں میں شاید ہی کوئی نظم ایسی ہو جسے نثری پیرایہ میں پڑھا جاسکتا ہو لطف کی بات یہ ہے کہ یہ نظمیں آزاد نظموں کی طرح مصرعوں میں لکھی گئی ہیں۔

---

۱۳ '' اردو کی ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ '' منظر اعظمی ص ۱۷۲

اردو ادب میں شعریات کی تنقیدی کا آغاز حالؔی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ہوتا ہے اس مقدمہ کو اردو تنقید کی بوطیقا کہہ سکتے ہیں۔ حالؔی کا مزاج مشرقی اور کلاسیکل تھا۔ لیکن انتہائی حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے کلاسیکی معیارات سے انحراف کیا شعر کے معنوی پہلو کو اہمیت دی اور جدید نظم نگاری کی بنا ڈالی انھوں نے شعر کی دو اہم خوبیاں اصلیت اور سادگی کا تقاضہ کیا موضوع اور طریقہ اظہار پر پابندی عائد کی اور ایسی شاعری کی سفارش کی جو حقیقت نگاری کے زمرے میں آتی ہو یہاں یہ نکتہ خاطر نشان رہے کہ حالی کی حقیقت نگاری سر سید اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر رہی ہے جسکا رشتہ ترقی پسند تحریک سے جوڑنا زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ حالانکہ ایک طائرہ نگاہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے یا بر بنائے مجبوری حالؔی کی شعری پابندیوں کا اثر قبول کیا ہے، اور مقصدیت وافادیت کو شاعری کا اصل اصول قرار دیا۔

حالؔی کی نظموں نے جہاں ایک طرف قوم و ملت کی خدمت انجام دی۔ وہیں دوسری جانب جدید شاعری اور بالخصوص جدید اردو نظم کے میدان میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ وہ جدید شعراء سے یوں مخاطب ہیں۔

کرنی ہے فتح گرنئی دنیا تو لے نکل !!
بیڑوں کے ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر یہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہوتی سمجھ اس کو شاذ تو[۱]

حالؔی نے 'شعر کی طرف خطاب' میں شائستگی راستی اور سادگی کو شعر کے لئے ضروری سمجھا یہ وہی اصول ہیں جو مقدمے میں سادگی اصلیت اور جوش لیکر بیان کئے گئے ہیں دراصل دونوں ہی بزرگوں نے اس صفات پر زور دیا ہے آزاد کہتے ہیں۔

''ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ تشبیہ

---

۱ حالی

شخصی محبت کو بنیاد بتایا ہے مگر تاثر آفرینی کا جواب نہیں یہی جذبہ کم وبیش حالؔی کے یہاں بھی ہے۔

اے شہر بریں کے سیارو ۔ اے فضائے بریں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا ۔ اے لب جو کی ٹھنڈی ہوا
اے نسیم بہار کے جھونکو ۔ دہر نا پائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز ۔ تھے وطن میں کچھ اور ہی چیز'' [۱]

حالؔی کو غزل کی فضا ہیں اور موضوعات میں عدم تسلسل کا بھی شکوہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق ہی عمل پیرا ہوئے اور انھیں اصولوں کے مدنظر اپنی تخلیقات کو حسن اور جلا بخشی ۔ انکا یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا گرچہ آزاد اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

حالؔی اور آزادؔ نے جدید نظموں کیلئے جو راہیں ہموار کیں ۔ اسپر بہت سے شعراء انکے اتباع میں چل نکلے اسماعیل میرٹھی نے بے قافیہ نظمیں لکھیں ۔ نظم طباطبائی اور شرؔر نے بھی تجربے کئے حسرتؔ موہانی کی ''ترانہ محبت'' اور سرورؔ جہاں آبادی کی منظوم بہ ترجمہ نظم ''مرغابی'' بے قافیہ نظمیں ہیں اسی طرح اردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید کے محتاج نہ رہی لیکن ایک اختلاف جوان دونوں کے مابین تھا برقرار رہا اور یہ انحراف کی صورت میں دو طرح سے نمودار ہوا پہلی شکل جدید مشینوں اور نئی روایتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی اور دوسری قدیم اصناف سخن میں جدید تجربوں کی شکل میں ۔ پہلی صورت میں سانیٹ دوسری صورت نئی ترتیب اور تزمین کے تحت تخلیقات سامنے آئیں ۔ اس دور کے زیادہ تر شعراء انگریزی ادب سے واقف تھے لیکن حالات کی ناہمواریوں کے سبب ان میں وہ شعور پیدا نہ ہو سکا کہ وہ حالؔی اور آزادؔ کے اصولوں کے بغیر ادبی جمالیات اور اس کے قدر و قیمت سے باخبر ہو سکیں ۔ انکے سامنے نظم کی

---

[۱] ایک نظم حالؔی

کامیابی کا معیار اـ کا محض نیچرل ہونا تھا۔ مگر کیا وہ نیچرل شاعری کے مفہوم سے بہ خوبی واقف تھے؟

عبدالحلیم شرؔر کے خیال سے اس سوال کی تائید ہوتی ہے۔

''مختلف لوگوں میں نیچرل شاعری کے مختلف معنی سمجھے جاتے ہیں بعض قومی شاعری اور حالؔی کے رنگ کو نیچرل شاعری فرماتے ہیں بعض حضرات نے اخلاقی نظموں کا نام نیچرل شاعری رکھ لیا ہے۔ وہ نصیحتانہ اشعار کہتے ہس اور انکو نیچرل شاعری کے لقب سے پبلک کے سامنے پیش کرتے ہیں'' [۱۵]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرؔر اس دور کی شاعری سے مطمعین نہیں حالی کی شاعری میں عصری رجحانات کا غلبہ سے ان پر تنقید بھی کی گئی اور حالات کے مطابق ان سے مستفید ہونے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔ حالی نے جو مشورے دئے اس پر عمل بھی کیا وہ اپنی شاعری سے جو کام لینا چاہتے تھے وہ لیا اور اس طرح شاعری میں اجتماعی شعور شعری افادیت 'ادب اور زندگی' بلکہ 'ادب اور اخلاق' کے اصولوں کے لئے راستہ ہموار کردیا بقول آل احمد سرور:-

''پوری اردو شاعری کو ماضی کے خوابوں سے چونکا کر حال کی تخلیقوں کا احساس دلایا۔ اس میں عظمت اور زندگی پیدا کی اور اسے زمانے کے دوش بدوش لا کھڑا کیا'' [۱۶]

---

[۱۵] ایک مضمون عبدالحلیم شرر [۱۶] نئے پرانے چراغ آل احمد سرور

جب ہم اقبالؔ کے ابتدائی دور کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ شروع سے ہی انھوں نے اپنی نظموں کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جس کا تعلق عوام الناس سے تھا۔ ابتدائی کلام میں ایسی نظموں کی کثرت ملتی ہے جن میں عام فہم اور دلکش اظہار خیال ہے ان نظموں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے موضوعات میں تنوع ہے ان میں عوام کی ذہنی سطح و ذوق سلیم کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ منظومات میں سنجیدہ غور فکر اور گہرائی و گہرائی کا فقدان ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ موضوعات پر بھی غور و فکر کا دامن ہاتھ سے اقبال نہیں چھوڑتے اور ہر قیمت پر شعری وقار کو قائم رکھتے ہیں۔

اقبالؔ کی ابتدائی نظموں کے موضوعات میں جدید خیالات ہونے کے باوجود تقریباً وہی جذبات ملتے ہیں جو حالیؔ اور آزادؔ کے یہاں تھے مثلاً مناظر فطرت، قومی جذبہ، حب الوطنی، ممالک اسلامی کے مسائل وغیرہ اقبالؔ کی بیشتر نظمیں معاشرتی اور قومی کمزوریوں کے تحت منظر عام پر آئیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے ہمنوا اور انکے ہم وطن ایک ایسی عظمت سے مالا مال ہوں جس پر دنیا کے تمام مملک رشک کر سکیں۔ چنانچہ اقبالؔ نے ستاروں کو اپنے ممالک کا باشندہ تصور کرتے ہوئے یوں صدا دی۔

اے شب کے پاسبانو اے آسماں کے تارو
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
کبھی بے زبانی انجم سے دنیا والوں کو یوں آگاہ کیا
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نقطہ تاروں کی زندگی میں"[۱]

دراصل اقبال مشرق کے دلدادہ تھے مگر مغرب کے فکری رجحانات سے بھی بے حد متاثر تھے انھوں نے مغرب کی مادی ترقی کو عروج پر دیکھا تھا اور اسے مشرقیوں کی ترقی

---

۱ اقبال

کے لئے ضروری سمجھا لیکن وہ مغربی تہذیب کی مادہ پرستی کے منکر تھے کیونکہ وہ روحانیت سے عاری تھی اسی لئے انھوں نے تصوف کے ذریعے روحانیت پر زور دیا۔ مشرق ومغرب کے فکری امتزاج سے اقبالؔ نے ایک جدید معاشرے اور ایک نوع انسان کا خواب دیکھا اور اس کو اپنے تصورات کے ذریعے ایسی روحانیت بخشی جو تخلیق آدم کا بنیادی مقصد تھا۔

اقبالؔ کی نظموں میں مظاہر سے روحانی وابستگی کا احساس ملتا ہے۔ موضوعات البتہ مختلف ہوسکتے ہیں مگر اظہار میں جذبے کی شدت خوبصورتی اور شائستگی جا بجا خود کلامی کی کیفیت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ تراکیب وتشبیہات میں ندرت ہے اور بیشتر نظموں میں ایک منفرد احساس نظر آتا ہے۔ اقبالؔ کا زاویہ نظر افادی ہے وہ مقصدی ادب کے قائل ہونے کے باوجود شعر کے فنی محاسن کی اقدار کے محافظ ہیں انکے نزدیک شعر کی فنی قدر رر جزدابہامیت 'طرز اظہار' اور 'اشعار کی منفرد پیش کش' اور شاعری کی شخصیت میں پوشیدہ ہے۔ وزیرآغا نے اس انفرادیت کی تعریف یوں کی ہے۔

''انفرادیت کی طرف اقبالؔ کا یہی رجحان اسے جدید
اردو نظم کا اولین علمبردار قرار دینے کے لئے کافی ہے'' [۷۱]

اقبالؔ نے اپنی شاعری میں تصورات کا سہارالیا ہے ان تصورات کو حقیقت کا جامعہ پہنانے میں خوبصورت تشبیہات استعارات اور مخصوص علامات کا بڑا دخل ہے ان کے یہاں دائمی قدروں کو اہمیت ہے۔ جدید نظم میں دائمی قدروں سے وابستگی اور نظم نگاری کے لئے نئی فنی امکانات کا آغاز اقبال ہی ہیں۔

اقبالؔ نے نظم کی ہیت کے سلسلے میں ایک خاص عنایت یہ کی ہے کہ انھوں نے ہیئت کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے بھی بعض غیر معمولی تجربے کئے اقبالؔ نے ہی پہلی بار

---

۷۱ ''اردو شاعری کا مزاج'' وزیرآغا ص ۴۶

ہیت کو خیال کا تابع تسلیم کیا۔ اسکا مشاہدہ 'بانگِ درا' کے انسان اور ''حسن عشق'' کے بندوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پابند ہیئت ہوتے ہوئے اپنی نظموں میں نئے تجربہ کرر ہے تھے اور اپنے دور کے تقاضے کو پورا کرنے کیلیے اقبال ایسی تخلیقات کرر ہے تھے جسکا تعلق صرف شعوری سے تھا۔ وہ صرف موضوعات کے شاعر ہی نہ تھے بلکہ انھیں نظموں کی صوری حقیقت کا بھی شعور تھا۔ اور اسی شعور کی بنا پر وہ خود کو روایت پسندی کی گرفت سے آزاد کرر ہے تھے۔ اپنی نظموں کو جدت اور ندرت عطا کرنے میں اقبآل نے معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے اضافے کئے ہیں اور منظوم نگاری کی جدیدیت کے لئے نئے امکانات فراہم کئے۔

اقبآل منظوم نگاری کے باشعور اور بیدار فنکار تھے انھوں نے اپنی شاعری سے صرف اپنے عہد کو ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو متاثر کیا ہے یہ تاثرات طرز فکر سے زیادہ طرز اظہار کے تھے سچ پوچھئے تو بیسویں صدی میں اردو فارسی ادبیات نے اس ایک شاعر کی بیداری کی برکت سے کم از کم ایک صدی کا فاصلہ طے کیا یعنی وہ تجدید جو ایک صدی کے بعد ہونے والی تھی اقبآل نے اپنے طرز اظہار کے ذریعے برسوں پہلے عطا کر دی اور اردو ادب عالمی پیمانے کے مسائل حاضرہ سے دو بدو بلت کرنے کے قابل ہوا۔

اقبالؔ جوشؔ اور فراقؔ کے بعد حقیقی شعراء میں مخدوم اردو کی کلاسیکل شاعری کے مجذوب ہیں۔ انھوں نے نام آور ترقی پسند شعراء کی مانند جدید شاعری کو اپنی ترقی کا زینہ نہیں بنایا فیض احمد فیض، علی سردار جعفری کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی جیسے شعراء کی طرح وہ کسب معاش سے مستغنی نہ تھے۔ غربت اور محنت کشی انکا مقدر تھی وہ اشتراکیت کے علمبردار ہیں اگر چہ ابتدائی دور میں جوشؔ واختر شیرانیؔ سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ اثرات زائل ہوتے گئے اور ان کی نظمیں ان کی ذاتی تفکرات جذب واحساس کا آئینہ اور ان کا اپنا شناخت نامہ بن گئیں علاوہ ازیں یہ نظمیں صناعی اور کاریگری کا پیکر ہی نہیں بلکہ بے ساختگی آمد، موسیقیت اور شعریت کی شاہکار ہیں۔

مخدومؔ کی حیثیت جدید نظم کے بانیوں میں اہم ہے کیوں کہ انھوں نے پہلی آزاد نظم تخلیق کی جو بے حد کامیاب ہے یہ موثر ترین نظم جدیدیت کی پیش رو تھی جس میں ارتکاز فکر کے ساتھ ندرت بیان بھی ہے۔ یہ کامیاب ترین نظم 'اندھیرا' شاعری کی استقامت واعتماد کا مظہر، نیز ہیئت کے اعتبار سے بھی خوبصورت ہے۔

''رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے گئے اجالے میں مگن
یہی جو ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزرائیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار

ناروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں ں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
سر دھوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں [۱]

اس نظم میں ارتکاز فکر بھی ہے اور ندرت اظہار بھی دوسری جنگ عظیم اور اس کی ہولناکیوں کے پس منظر میں کہی ہوئی یہ نظم شاعر کے اس یقین اور اعتماد کا اظہار بھی کرتی ہے کہ نظام جبر کے پاس ''اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں'' اور اسکا وجود صرف خورشید درخشاں کے طلوع ہونے تک باقی ہے۔

اندھیرا نظم کے علاوہ 'سرخ سویرا' 'انقلاب' بھی انکی سیاسی و معاشی بصیرت کا ثبوت دیتی ہے۔ مخدومؔ انقلاب کا انتظار بھی محبوب کے قدموں کی آہٹ کی طرح کرتے ہیں۔

اے جان نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
تیرے لئے یہ زمیں بےقرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے '' [۲]

کبھی کبھی شاعر کو داخلی کرب کا اظہار خارجی شکل دینے کیلئے اور اس کے تجربے اور محاسبہ کے لئے عرصہ درکار ہوتا ہے۔ مخدومؔ اس عمل سے گزرنے کے بعد 'بساط رقص' اور 'گل تر' کی تخلیق کر سکے اس شاعری میں انقلابی جذبہ وامنگ میں وہ جوش نہیں۔ زبان و بیان کی قطعیت کسی قدر مبہم اور استعاراتی شکل اختیار کر چکی ہے انقلابی نظریہ ایک کسک بن چکا ہے اور یہیں پر مخدومؔ کو وہ اعتبار حاصل ہوا جس کا ایک ماہر فنکار متلاشی رہتا ہے اس کا اعتراف مخدوم نے یوں کیا ہے۔

---

[۱] ''اندھیرا'' [۲] ''سرخ سویرا'' مخدومؔ

شاعر اپنے گرد پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں
مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے یہی تضاد تخلیق کی قوت حرکہ بن
جاتی ہے شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی
آمیزیش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرنا
اور شعر میں ڈھالتا ہے۔'' ۱۸

مخدوم کی سب سے خوبصورت لاثانی شاہکار نظم 'چاند تاروں کا بن' ہے یہ نظم
ایک جانب جہد مسلسل کی تاریخ پیش کرتی ہے تو دوسری جانب حصول آزادی کے اثرات کو بھی
اجاگر کرتی ہے اس نظم میں ماضی حال و مستقبل کے تسلسل اور حسین سے حسین تر کی تلاش داستان
منزل بہ منزل جذبہ حوصلہ رواں ہے جہاں مایوسی اور ناامیدی کا گزر ہی نہیں۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن

رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے
منتظر مرد و زن
صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خار زار الم بن گئے ۱

یہی حوصلہ مند شاعر جب نظم 'سناٹا' کے تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اسکی کرب
و بے چینی اور تڑپ اپنے عروج پر ہوتی ہے جو دیدنی ہے:-

---

۱۸ ''پیش لفظ'' 'گل تر' مخدوم ۱ ''چاند تاروں کا بن'' مخدوم

کوئی دھڑکن نہ کوئی چاپ نہ سنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن
ایسے سناٹے میں ایک آدھ کوئی پتا کھڑکے
کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر
کوئی رخسار نو چمکے، کوئی بجلی تو گرے [۱]

مخدوم کا دور جدیدیت کا بانی ہے ابتدائی دور میں ہی مخدوم جیسے شاعر نے ایسی نظمیں پیش کر دیں تھیں جسے دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ جیسے انھوں نے برسوں کے مشاہدے وجد جہد کے بعد حقیقت حال کی ترجمانی کی ہے یہ نظمیں 'نیا سال' 'اور یہ شہر' ۴۰ سال کے عرصہ دراز کے بعد بھی جدید ترین نظریات کی حامل ہیں۔ بطور مثال یہ نظم پیش کی جاسکتی ہے۔

کروڑوں برس کی پرانی
کہن سال دنیا
یہ دنیا بھی کیا مسخری ہے
نئے سال کی شال اوڑھے
بہ صد طنز ہم سب سے یہ کہہ رہی ہے
کہ میں تو نئی ہوں
ہنسی آرہی ہے [۲]

یہ شہر اپنا

---

[۱] ''سناٹا'' [۲] ''نیا سال'' مخدوم

عجیب شہر ہے کہ راتوں میں
سڑک پہ چلئے تو سر گوشیاں سی کرتا ہے
وہ لا کے زخم دکھاتا ہے
راز دل کی طرح دریچے بند
گلی چپ
نڈھال دیواریں
کواڑ مہر بہ لب
گھروں میں میتیں ٹھہری ہوئی ہیں
برسوں سے کرائے پر[۱]

مخدوم جدید شاعری کے وہ حقیقی شاعر تھے جنھوں نے جدیدیت کو اپنانے میں جہاد کیا انھوں نے اس تحریک کو جس خلوص و عقیدت سے اپنایا اس کی نظیر دور۔ دور تک نہیں ملتی۔

---

[۱] ''اپنا شہر'' خصوصی گوشہ مخدوم حقیقی شاعر

ترقی پسندیت نے اگر اردو شاعری کو فکر و خیال کی وسعت اور موضوعات کی رنگارنگی عطا کی تو دوسری جانب ہدف تنقید و تجزیہ بنیں لیکن اس دوڑ میں کچھ ایسے شعراء بھی سامنے آئے جنھوں نے فکر و فن کے درمیان ہم آہنگی کو ملحوظ ادب رکھا اور تجربے کے نام پر اپنے فن کو مجروح کرنا کسی طرح گوارہ نہ کیا مجازؔ کو ترقی پسند شعراء کی ایسی فہرست میں اولیت حاصل ہے۔

۱۹۳۵ء میں جب مجازؔ ردولی میں مقیم تھے تو یہیں سے ان میں ترقی پسندی کے رجحانات کا آغاز ہوا اس کا سبب یہ تھا کہ علی گڑھ اس وقت ترقی پسند نوجوانوں اور جدیدیت کے بانیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ علی سردار جعفریؔ، جاں نثار اختر، سبط حسنؔ وغیرہ موجود تھے۔ محمد حسین شکوہ نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:-

> ''یہ گروپ یونیورسٹی میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور اس گروپ کا ہر فرد ایک مخصوص فن کا مالک اور سب اپنے اپنے نئے ہتھیاروں سے مصلح پرانے اور فرسودہ نظام سے برسر پیکار تھے۔ اور نئی قدروں کو فروغ دینے کی دھن میں محو تھے علی گڑھ کے اس نئے پیدا ہونے والے شعور کی رفتار کبھی کبھی حد سے تجاوز کر جاتی تھی'' [۱۹]

مجازؔ ایک دردمند اور بے حد حساس دل کے مالک تھے انھیں اپنے ملک کی زبوں حالی کا مکمل احساس تھا وہ تحریک آزادی کے حوالے سے بھی اردو شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھیں جذبہ حریت ہر وقت بے چین رکھتا تھا۔ انھوں نے تنگ دستی افلاس اور ملک میں ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف آوازیں اٹھائیں اور آزادیٔ وطن کا نعرہ لگایا وہ شاعر بیدار اور شاعر آتش کی طرح زمانے کے تقاضوں اور مخلوق کی مجبوریوں سے تاحیات متاثر رہے جس کا اظہار بار بار اپنی نظموں میں کرتے رہے:-

---

[۱۹] ''مجاز سوانح شخصیت اور شاعری'' محمد حسین شکوہ

'' پھنک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب''

اور اسی شور سے پیدا ہونے والے نتائج کی آگاہی یوں دی:-

''ختم ہو جائے گا سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
حشر درآغوش ہو جائیگی دنیا کی فضا
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونی سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب وتاب
جگمائے گا وطن کی حریت کا آفتاب''[۱]

مجاز نے اس نظم میں جو پیشن گوئی کی وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تقریباً ڈیڑھ سو سال تک مجبور ومحکوم ہندوستان نے خون کے سیلاب دیکھنے کے بعد آزادی کی سانس لی اور اس کو سابقہ وقار حاصل ہوا۔ مجاز نے آزاد ہندوستان کے نوجوانوں کو محبت اخوت رواداری و یگانگت کی بنیاد پر جہان نوتعمیر کرنے کیلئے ایک نئے جذبے کے ساتھ اکسایا۔

'' اٹھو نقارۂ افلاک بجادو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگادو اٹھکر

ان کی دوررس نگاہوں نے ہندوستان کو ایک نئے رنگ میں دیکھ لیا تھا۔ وہ جو

---

[۱] مجاز

انان قوم کو ہی جدید ہندوستان کا بانی سمجھتے تھے مجاؔز کے یہاں عالم جدیدیت کے علمبردار شعراء کی مانند بے راہ روی نہیں ملتی وہ جدیدیت کے بانی ضرور ہیں پر قدیم روایات سے انحراف نہیں کرتے انکی نظموں میں کلاسکی شعراء جیسی سادگی و پرکاری ہے۔ جو انکی انقلابی نظموں کو بھی نعرہ بازی کی کیفیت سے دور رکھتی ہے۔

اردو کے بیشتر ناقدین نے عہد حاضر کے اس مقبول شاعر مجاؔز کی شاعری کے تعین قدر کے سلسلے میں واضح طور پر سہل نگاری اورتن آسانی کا ثبوت دیا ہے کلیم الدین احمد نے اس عام تنقید روش سے انحراف کرتے ہوئے مجاؔز کے کلام کو تجزیہ کے عمل سے گزار کر یہ نتیجہ برآمد کیا کہ ان کے یہاں روحانیت کی خوبیاں کم نقائص زیادہ ہیں بلکہ بیشتر نظموں میں کسی عمیق تجربہ کا بیان نہیں ملتا کلیم الدین نے مجاؔز کی نظم 'نورا' کی اجمالی تشریح کے بعد لکھا کہ یہ نظم ایک شرارت ہے اس قسم کے معمولی اور سطحی جذبے موضوع شاعری نہیں ہو سکتے ان کے نزدیک مجاز کی تخلیقات میں عموماً کس تجربہ کا وجود نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو یہ تجربہ غیر اہم اور نا قابل اعتناد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے تنقید کا یہ رویہ پروفیسر کلیم الدین احمد کا ہے جن کی نوک قلم سے ان کے والد محترم کے علاوہ کوئی نہیں بچ سکا ہے۔

بہر کیف مجاؔز کے کلام پر یہ اعتراض قابل قدر نہیں کیوں کہ فن کی دنیا میں کوئی تجربہ اعلیٰ ادنیٰ سطحی یا ارفع فام یا پختہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے اظہار کی نوعیت زیادہ اہم ہوتی ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تجربے کا فن کارانہ اظہار ہوا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی تخلیق کمزور یا سطحی نظر آتی ہے تو اسکا سبب نا تجربہ کاری نہیں بلکہ Exprassion کی ناکامی ہوتا ہے یہ ممکن ہے کہ مجاؔز کی بعض نظمیں اظہار کی ناکامی کے باعث یک رخی اور یک رنگی ہوں ایک طرف مجاؔز کو رومانی شاعر قرار دینا اور دوسری جانب نا تجربہ کاری کا الزام لگانا کسقدر عجیب بات ہے۔

مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی   جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی   لب لعل افشاں سے اک شئے چرالی

ایک رومانی شاعر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو وہ تجربات اور دورس نگاہیں رکھتا ہے اور یہی تجربے اس کے خیالات کو حسین پیکر عطا کرتے ہیں رومانی شاعر کے بعض دیگر عناصر مثلاً احساس تنہائی اور اپنی خوبیوں کا تفصیلی ذکر بھی مجاز کی شاہکار نظم 'آوارہ' میں ہوتا ہے

مثلاً

'آہ کون سمجھے کون جانے دل کا حال'،
'اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں'،
'اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے'

'آوارہ' میں مجاز نے اس امر کا بھی خیال رکھا ہے کہ ہر بند خواہ اسکا تعلق خارجی منظر کشی سے ہو یا داخلی احساسات کی ترسیل سے جذباتی ردعمل کا اظہار کرے اس مرکزی تنظیم کے علاوہ ۱۵ بندوں پر مشتمل یہ نظم اپنے چھ بندوں میں خارجی مظاہر کی عکاسی سے عبارت ہے اور ۹ بندوں میں داخلی وجود کی دیگر کیفیات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور ان مظاہر کی وساطت سے معاشرتی چیرہ دستی کی ترسیل سے پوری نظم کا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ نظم کا عنوان 'آوارہ' سے لیکر آخری بند تک افعال کا اثر ہے خلاقانہ استعمال مجاز کی بالغ النظری کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتا ہے۔

مجاز کے یہاں رومانی احساس کے ساتھ ساتھ ایک آتشیں احساس بھی ملتا ہے جو انکے معاشرتی شعور کا آئینہ دار ہے۔

''یہ ہیں فتنہ بیدار مٹادو ان کو
یہ مٹادیں گے تمدن کو مٹادو انکو
پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلادو ان کو

شان شایان وطن ہو یہ بتا دو ان کو

یاد ہے تم کو کس اسلاف کی تم یادیں ہو

تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو''

خالد کے پسر اور بھیم کی اولادیں کہ کر مجاز نے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں وغیرہ کو مخاطب کیا ہے اور سماجی طبقائی کشمکش اور مشترکہ جدو جہد کی عکاسی کی ہے۔

''مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر

رات ہی تاری رہی انسان کی ادراک پر

عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا

دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا

نوجوانان نسل کو مجاز نے بارہا ذہن و دل کی تاریکی دور کرنے کا درس دیا انکا خیال تھا کہ جب تک شیخ و برہمن کا غبار انکے درمیان رہیگا حب الوطنی کے جذبات سے وہ ناآشنا رہیں گے اور آزادی کے لئے اعتقاد وایثار شرط اوّل تھی یہی شرط انکو خواب سحر کا مژدہ دینے والی تھی

''ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں

زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے

جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے''

انھوں نے نئی نسل کو ایک نئے جذبہ کے ساتھ غیرت و شرافت کے پاسبان بن کر ظلم و ستم کی حکمرانی اور اسکی شعلہ فشانی کو ختم کرنے کے لئے یوں حوصلہ افزائی کی۔

''رنگ گلہائے گلستاں وطن تم سے ہے
شورش نعرہ زنداں وطن تم سے ہے
تشنہ نرگس خوباں وطن تم سے ہے
عفت ماہ حسیناں وطن تم سے ہے
تم ہو غیرت کے امین تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہے احساس تمہیں ہے کہ نہیں''

فیضؔ راشدؔ اور میرا جیؔ ایسے شعراء ہیں جن کے تاثرات سے اس دور کا کوئی شاعر نہ بچ سکا۔ اختر الایمان نے بھی فیضؔ اور میرا جیؔ کا اثر قبول کیا ان کے یہاں بھی راشد اور فیضؔ کی طرح معاشرتی اور اخلاقی مسائل سے دلچسپی ملتی ہے لیکن ان کو پیش کرنے کا انداز اور انکا فکری زاویہ نظر ان لوگوں سے مختلف رہا ہے وہ بنیادی طور پر اقدار کے شاعر ہیں اور اقدار کا تعلق ماضی اور حال سے زیادہ ہوتا ہے اس طرح ان کی رسائی ماضی اور حال تک ہے۔ بس وہ اسی دوز مانوں کے شاعر کہے جا سکتے ہیں اس طرح وہ میرا جیؔ سے زیادہ نزدیک نظر آتے ہیں لیکن اس تحدید کے ساتھ کہ میرا جیؔ کا تعلق معاشرتی مسائل سے قطعاً بے گانہ ہے جب کہ اختر الایمان راشد اور فیضؔ کی طرح صرف سماجی شاعر نہیں زبیر رضوی نے اپنے مضمون 'اختر الایمان قادری' میں ان کے فن اور شخصیت پر یوں وضاحت کی:۔

> اختر الایمان اکیلے شاعر ہی جنھوں نے اپنے ہر نئے شعری مجموعے میں اپنی شاعری موضوعات زبان علامتوں اور اپنے استعارتی نظام کے بارے میں دیباچہ کی صورت میں کچھ نہ کچھ نیا یا پہلے کا کہا ہوا دہرایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اختر الایمان کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ شاعری پڑھنے والوں کا مزاق غزل شاعرے اور غزل کی تنقید نے اس قدر سہل آگیں بنا دیا ہے کہ نظم کی قرأت کے لئے جس طرح کے فکری کدوکش کی ضرورت ہے'' [۲۰]

۴۷ء کے بعد اختر الایمان کے زاوئیہ نظر میں تبدیلی ہوتی اور انکی شاعری کے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے' اور اقداری و معاشرتی زندگی میں آنے والی تبدیلیاں اور اسکے فقدان وغیرہ انکے اہم موضوع ہیں وہ زندگی کی کشمکش میں ماضی کے قدروں کو سینے سے لگائے نظر آتے ہیں یعنی وہ ماضی کے اقدار کو حال میں بکھرتا ہوا دیکھتے ہیں مگر ایک ایسے تماشائی کی

---

۲۰ '' اختر الایمان اور قاری'' زبیر رضوی ذہن جدید جدید نظم نمبر

طرح جو مجبور و بے بس ہو اور جسکی ساری صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہوں اس شکست کی ابتدا تنہائی سے ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ زمانۂ حال سے بیزاری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

آخر الایمان کی شاعری ماضی کے ان سارے تجربات کی عکاسی ہے جس کا تعلق ان کی انفرادی شخصیت سے ہے ماضی کے یہ سارے تجربات اختر الایمان کے شعور کا ایک حصہ بن گئے ہیں اور وہ زندگی کی شاہراہ پر ہوں یا دوراہے پر یہ یادوں کی شکل میں ہر جگہ انکا تعاقب کرتے ہیں۔ جو انکی نظموں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں:-

''لطافت ٹھنڈے پانی کی کریں محسوس کچھ تھوڑا بہل جائیں
ہنسیں بے وجہ یونہی غل مچائیں بے سبب دوڑیں
اڑیں ان بادلوں کے پیچھے اور میلوں نکل جائیں''

''کہاں جائیں گے اپنے آپ سے ہم بھاگ کر آخر
زمیں تو گول ہے واپس یہیں آ جائیں گے اک دن
سرے جو زندگی کے کھو گئے ہیں اک اندھیرے میں
وہ مل جائیں اگر آغاز او رانجام کیا ہوگا'' [۱]

اس بھرے حشر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے او بے او سر پھرے
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر

---

[۱] '' ارض ناکس'' ختر الایمان

گالیاں دیں ہنسیں ہاتھا پائی کریں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں ایک دوسرے کو سنیں اور کہیں
اور اس نیک روح کے بازار میں
مری یہ قسمتی بے بہا زندگی
ایک دن کے لئے اپنا رخ موڑ لے'' ۱؎

اختر الایمان تا حیات زندگی کی معنویت تلاش کرتے رہے وہ کوئی فلسفی تو تھے نہیں ایک حساس شاعر تھے انکے احساسات صرف یہی معلومات فراہم کر سکے کہ انسان کے اصولوں اور عملی زندگی میں کافی فاصلے ہو گئے ہیں جنھیں پر کرنا ناممکن سا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں :-

''انسان اور انسانی سماج آدمی اور معاشرے ایک دوسرے سے دور جانے لگے ہیں۔ آدمی کو جینا تھا زندہ رہنا تھا۔ وہ معاشرہ اور سماج کے ساتھ سمجھوتا کرنے لگا شاعر نہیں کر سکا۔ بس ایک دن شاعر دو شخصیتوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک شاعر ایک دنیا دار یا عام آدمی اسلئے مری شاعری اسی ٹوٹے ہوئے آدمی کی شاعری ہے ۲؎

یہ وہ احساسات ہیں جنھیں اختر الایمان نے '' جدید عصری حقیقت تسلیم کیا ہے۔ جدید شعراء پر تنقید کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں یوں اظہار خیال کیا :-

''پہلے کے لوگوں کو دیکھئے فراق تھے فیض تھے میرا جی تھے راشد تھے میں ہوں مجاز تھے ان لوگوں کے یہاں جو تلاش تھی وہ اب

۱؎ ''تبدیلی'' اختر الایمان ۲؎ ایک مضمون اختر الایمان

کسی کے یہاں ہے؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان شاعروں نے
اپنے پہلے کے دور کے شاعروں کو SURPASS کیا ہے
انھوں نے اضافہ کیا ہے کہ شاعری میں ادب آج کون نمائندہ
شاعر ہے؟ کون ہے جس کا کلام پچھلے شاعروں کو SURPASS
کر گیا ہو'' [۲۲]

اور اس کا اظہار اپنی شاہکار تخلیق 'کالے سفید پروں والا پرندہ' 'مری ایک شام'
اور 'نظم کی تلاش' میں یوں کیا ہے:-

'' متاعِ رائیگاں بے فرقہ و پوشاک نورانی
بہت بے چین کرتی ہے مجھے میری تن آسانی
تفکر جو بھٹکتی مشک کا ایک جھونکا
تخیل جو کوئی آوارہ بادل تھا اڑا جاتا تھا بے پرواہ
اسے میں نے سماجی برتری کی دوڑ میں جانے کہاں چھوڑا
یہ ایسے اور کتنے ہی ملامت خیز اندیشے
بسا اوقات ایسے گھیر لیتے ہیں مجھے آکر
کہ میں آوارہ بادل مشک بو کے رفتہ جھونکے کے تعاقب میں نکلتا ہوں
یوں ہی بے سمت چلتا ہوں۔'' [۱]

اختر الایمان نے وقت کی گرفت صرف احساسات کی تاریخ میں ہی نہیں
محسوس کی۔ بلکہ اپنی دیہاتی زندگی میں اسکا مشاہدہ کیا۔ جیسے جیسے انکی زندگی کا سفر گزرتا رہا۔
ماضی کی یاد کبھی مسرت کے لمحات بنکر کبھی یاس و ناکامی کی سوغات لیکر انکے حافظے کی مدد سے

---

[۲۲] ایک انٹرویو اختر الایمان [۱] ''میری ایک شام'' اختر الایمان

دہراتی جاتی رہی ہیں کچھ اس طرح

''دن تو کالے پروالے بگلے ہیں

جو سب لمحوں کو

اپنے پنکھوں میں موند کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

چاروں جانب رنگ برنگے جھنڈے اڑتے ہیں

سب کی جیبوں میں انسانوں کے دکھ درد کا رومال

خوشبون کا نسخہ بندھا پڑا ہے

لیکن ایسا کیوں ہے

جب نسخہ کھلتا ہے

۱۸۵۷ جاتا ہے

۱۹۴۷ آ جاتا ہے'' [۱]

اظہار بیان کی یہ ساری نوعیتیں ہمیں یہ غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کہ ان تجربات کے پس پردہ انکا کوئی مخصوص تصور کارفرما ہے محض اتفاق تو نہیں ہو سکتا اختر الایمان 'یادیں' کے دیباچے میں اپنے مخصوص تخلیقی خوف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''وہ تجربوں اور اسکے اظہار کے درمیان میں

زمانی فاصلہ رکھتے ہیں۔ جب تک کوئی تجربہ

یاد نہ بن جائے اظہار کی صورت میں نہیں ڈھلتا'' [۲۲]

اختر الایمان نے جس تصور کو تخلیقی عمل قرار دیا یہ انکے اظہار پہ کسطرح اثر انگیز ہوا اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے دراصل کسی مخصوص تصور کے مدنظر انکی تخلیقات وجود میں نہیں

---

[۱] ''کالے سفید پروں والا پرندہ'' [۲۲] ''دیباچہ'' ''یادیں'' اختر الایمان

آ ئیں۔ لیکن تخلیقیات میں ہونے والی تبدیلیاں انکے پرزور مشاہدے کی عکاس ہیں ۔ جونئ شعریت کی شکل میں ہمارے سامنے آئیں۔

''دیارِ غیر میں کوئی جہاں نہ اپنا ہو
شدید کرب کی گھڑیاں گزار چکنے پر
کچھ اتفاق ہوا ایسا کہ ایک شام کہیں
کسی اک ایسی جگہ سے یونہی ہو میرا گزر
جہاں ہجوم گریزاں میں تم نظر آؤ
اور ایک ایک کو حیرت سے دیکھتا رہ جائے'' [۱]

اختر الایمان نے تاثرات کے اظہار میں ہمیشہ روایتی اسالیب کا ہی سہارا نہیں لیا بلکہ لفظوں کے انتخاب میں اکثر انفردیت اور جدیدیت کو قائم رکھا۔ اس انفرادیت سے انکا مقصد صرف اظہار بیان کو جدید انداز میں پیش کرنا نہ تھا بلکہ اور انکے ذریعہ انھوں نے تصورات میں جدید تاثر پیدا کرنا چاہا۔

ایک میلہ ہے پریشاں یہی امیدوں کا
چند پژمردہ بہاروں کا خیال آیا ہے
پاؤں تھک کے دہے جاتے ہیں مایوسی میں
پرمحن راہ گزاروں کا خیال آتا ہے
ساقی و بادہ نہیں، جام ولب جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

یہ نظم افسردگی اور مایوسی کا مکمل خاکہ پیش کرتی ہے پژمردہ بہار پرمحن راہ گزار ساقی و بادہ جام ولب جو ساری ترا کیب روپتی انداز میں آئی ہیں نظم' مجرد' صفات کے سبب ہی ایک انوکھا تاثر پیش کرتی ہے یہ صفات انکی نظموں میں عموماً نظر آتی ہیں انھوں نے متضاد سچویشن (Opposit Situation) سے اپنے تجربے اور مشاہدے میں پوشیدہ شعری صداقت کو نمایاں کیا جسکا فائدہ متاخرین نے بھی حاصل کیا ہے۔

مجموعی طور پر اختر نے تجربے سے اظہار اور روایت سے غیر روایتی انداز میں جدت پسندی کی جانب جوقدم اٹھائے وہ اپنے عہد کے تقاضون اورفکری فنی محاسن سے قریب تر ہیں۔ وہ اپنے قریب ترین ماضی سے وابستہ ہوتے ہوئے جدید شعری روایات سے رشتہ استوار رکھتے ہیں یہی رشتہ انکو شاہکاری فن عطا کرتا ہے۔ایک مقام پر وہ تحریر کرتے ہیں:-

> ''شاعر کا کام زندگی میں ایک توازن پیدا کرنا ہے
> اور اسکے اندر جو حیوان ہے اسکی نفی کرنا، جہد تو جاری
> رہیگی مگر اہل فکر و علم بھی انگلیاں فگار و خامہ خوں
> چکاں لئے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔اس کارواں
> کا ایک آدمی میں بھی ہوں'' ۲۴

اردو کی پوری شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے حصار کے باہر اور حصار کے اند، حصار کے اندر والی شاعری وہ ہے جو ہم مشاعروں میں سنتے آرہے ہیں۔سوا تھوڑی سی زبان کی تبدیلی کے اس شاعری میں کوئی فرق نہیں آیا۔صدیاں گزر گئیں ان کی کوئی چھاپ کوئی نشان قدم دکھائی نہ دیا۔حصار کے باہر والی شاعری وہ ہے جو نئے تجربات' نئے میلانات اور نئے شعور کی ترجمانی کرتی ہے۔اس سلسلے کا آغاز غالب اور حالی سے ہوتا ہے شاعری میں فکر کا عنصر یہیں سے شامل ہوا۔

---

۲۴ ''سروساماں'' اختر الایمان

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اختر الایمان کی شاعرانہ عظمت پر اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"سماج کے تلخ حقائق نے انھیں میراجی یا راشد کی طرح نہ تو قرار کلبیت کی طرف مائل کیا۔ نہ جنس کے نہاں خانوں کا اسیر کیا۔ ان کے یہاں یاس وامید اندھیرا اجالا نیکی بدی انسانیت اور حیوانیت کی کشمکش اور مستقل پیکار ملتی ہے جس نے انکی نظموں کو ایک ڈرامائی لب ولہجہ اور اسلوب دیا۔ جس میں بیک وقت گہرائی اور مانوسیت ہے" ۲۵

اختر کو زندگی کے متضاد پہلوؤں کی عکاسی میں جو مہارت حاصل ہے اسکا اعتراف جدت پسند شاعر باقر مہدی کو بھی ہے لکھتے ہیں :-

"جدید اور ترقی پسند شعراء میں فکری عناصر کی خاصی کمی ہے مگر یہ الزام اختر الایمان کی شاعری پر نہیں لگایا جاسکتا وہ زخم کھایا ہوا دل ہی نہیں رکھتے بلکہ ایک فلسفیانہ دماغ کو بھی شاعری میں نمایاں جگہ دیتے ہیں" ۲۶

اختر الایمان کا شعری سفر اگرچہ ایک سطح پر ایسا تدریجی سفر محسوس ہوتا ہے جس میں ایک حد تک ایک مقام تک بار بار زندگی کے اندیشوں کا ذکر ملتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اختر نے ایک ایسا جہان نو تخلیق کیا جس میں متضاد موافق مظاہر بہ یک وقت موجود ہیں۔
جدید منظوم نگاری میں صرف موضوعات کی تبدیلی ہی نہیں ہوئی بلکہ اسمیں

---

۲۵ "اختر الایمان اور نظم کا قاری" خلیل الرحمٰن اعظمی ۲۶ "ایک مضمون" باقر مہدی ذہن جدید ص ۱۷

ہیئت میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ آزاد نظم اسی دور کی دین ہے لیکن ترقی پسند شعراء نے آزاد نظم سے گریز کیا ۔ کیوں کہ اس طرح کی کوئی جدت انکے افادی نظریہ کے خلاف تھی، مخدومؔ اور سردار جعفریؔ نے بعد میں لیکن فیضؔ نے شروع میں ہی اس ہیئت کو اپنا لیا تھا ۔

آزادنظم کوفروغ دینے میں دو نام بہت ہی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ن م راشد میراجی انکے علاوہ قیوم نظر یوسف ظفر، سلام مچھلی شہری خالد تاثیر، ضیاء جالندھری ان میں سے اکثر نے میراجی اور راشد کی تقلید کی اسکے بعد آزادنظم کا جو مجموعی پیکر سامنے آیا اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آزادنظم مغربی تاثرات کے تحت وجود میں آئی ۔ لیکن اس نے اردو ادب میں ایک جدید تصور پیش کیا۔ مغربی تصور سے قطعاً بے نیاز تھا۔ ان تصورات کو پیش کرنے میں دو طریق کار استعمال کئے گئے ایک کی نمائندگی راشد نے کی ۔ اور دوسرے کی میراجی نے میراجی اور خود کے طریق کار میں فرق راشد یوں بیان کرتے ہیں ۔

''جدید شاعری میں جنھوں نے ....
آزادنظم ترویج کی ہے تصدق حسین خالد اور میراجی کے
نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ دونوں نہ صرف
مصرعوں کے ارکان مقررہ تعداد اور قافیہ کی پرواہ نہیں
کرتے بلکہ مصرعوں کو ایک دوسرے سے ملاتے چلے
جاتے ہیں اسکے خلاف اگر آپ نے میری نظموں کا
مطالعہ کیا ہے تو آپکو محسوس ہوا ہوگا کہ ان میں اس
حد تک وجدت نہیں ہے بیشتر مصرعوں کو توڑ کر انکو مترنم
الفاظ سے مربوط اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہوں
میں نے آزادنظم سے شاعری میں خیالات کے
آزاد تسلسل کے ساتھ جامعیت پیدا کرنے کی کوشش
کی ہے'' ۲۷

جیسا کہ راشد نے خود تائید کی کہ وہ مصرعوں کو توڑ کر یوں استعمال کرتے ہیں کہ وہ ٹکڑا ایک اکائی کا کام کرتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ راشد صوتی آہنگ پر زیادہ زور دیتے ہیں

---

۲۷ ''ہیئت کا مسئلہ'' نیا دور کراچی

بطور مثال :-

بس اک زنجیر
ایک ہی آہنی کمند عظیم
پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک
میرے وطن سے تیرے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کی جال ہے جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہوکر تڑپ رہے ہیں

اسکے برخلاف میراجی طویل مصرعوں کا استعمال کرتے ہیں اتنے طویل کی سطروں تک پہونچ جاتے ہیں :-

ہوائیں، نباتات اور آسماں پر ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوئے چند بادل
یہ سب کچھ، یہ ہر شے میرے ہی گھرانے میں آئی ہوئی ہے
زمانہ ہوں میں میرے ہی دم سے ان مٹ تسلسل کا جھولا رواں ہے
مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے یہ کیسے کہوں میں
کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آکر ملے ہیں

میراجی نے تحلیل نفسی سے زیادہ کام لیا شعور کی سطح سے گزر کر لاشعور کی تہوں تک پہونچ جاتے ہیں مگر راشد کے یہاں یہ کوشش کم ہے بلکہ انھوں نے اقبال کی شعری روایتوں کا اثر زیادہ قبول کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے۔

''اقبالؔ اور راشدؔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً
ایک عہد کے شاعر ہیں اسلئے راشد کے اندر کا شاعر بھی
کم وبیش انھیں ذہنی اور فکری مسائل سے دو چار ہے
جسے ہم اقبالؔ کی شاعری میں تلاش کر سکتے ہیں راشد
کے یہاں بھی شاعر مشرق کی طرح مشرق کی چاہت موجود ہے'' ۲۸

راشد کا یہ شعر اس چاہت کا غماز ہے۔

اسی غور تجسس میں نئی راہیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر

اقبالؔ اپنے وقت کے نباض تھے وہ فرد کی آزادی اور سرکشی کے میلانات سے واقف تھے اقبالؔ کا مرد مومن اسی نظر کی پہچان ہے لیکن یہ مرد مومن صرف ایک مثالی ہستی ہے اسکے برعکس راشد کا فرد معاشرے میں ہر لحظہ تبدیل ہونے والے حالات سے دو چار ہوتا ہوا مغربی تعلیم وتہذیب میں بہتا ہوا وہ فرد ہے جو اپنی ساری خرافات کو منقطع کر چکا ہے۔ راشد کی بیشتر نظمیں اس فرد کے منفی رجحانات کی آواز بازگشت ہیں۔

''مجھ کو ہے اب تک تلاش
زندگی کے تازہ جولاں گاہ کی
اور بیزاری بھی ہے
زندگی کے کہنہ آہنگ مسلسل سے مجھے
سرزمین زیست کی افسردہ محفل سے مجھے ۱

---

۲۸ ''راشد کا ذہنی ارتقاء'' خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۰۲ ۱ ''ماورا پنہاں'' ن م راشد

''یا اتر جاؤں گا میں یاس کے ویرانوں میں
اور تباہی کے نہاں خانوں میں
تا کہ ہو جائے مُحیا آخر
آخرِ حدِ تنزل کی ایک دید مجھے'' [۱]

اسی طرح انکی بیشتر نظمیں زندگی سے کنارہ کشی چاہتی ہیں راشد زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے بغاوت پر اتر کر بھی مسرت اور شادمانی حاصل نہ کر سکے چنانچہ اردو نظم میں غالباً یہ ایک جدید موڑ تھا جب شاعر حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اس ماحول کی تخریب پر ہی آمادہ ہو گیا یہ بغاوت نئی طریق سے ابھری سب سے پہلے انھوں نے مروجہ مشرقی تصور سے بغاوت کی اور مشرقی تہذیب کو تخیلات کی دنیا سے نکال کر مادی حقائق سے روشناس کرایا۔ جدید نظم میں راشد کا یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہے کہ انھوں نے محبت کو تخیل کی تحدید سے آزاد تو کیا لیکن پسند نہ کیا۔ اور مادی پہلو کی افادیت کو اہمیت دی اور اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے۔

''اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھکو نشاں پائے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے'' [۲]

''آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک

---

[۱] ''جرأت پرواز'' ن م راشد [۲] ایک نظم ن م راشد

آ اسی خاک کو ہم جلوہ گہ راز کریں
روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں
آ اسی لذت جاوید کا آغاز کریں۔ [۱]

زندگی سے اس قسم کا فرار محض لمحاتی ہوسکتا ہے، حقائق سے عافیت نہیں دے سکتا۔ اس سے راشد کی نظموں میں مایوسی برقرار رہتی ہے انکے کلام میں ایک تڑپتے اور سسکتے ہوئے فرد کا احساس ہوتا ہے راشدؔ نے اس فرد کے جذبات کی عکاسی میں اپنے جدید نقطہ نظر کے حوالے سے فنکارانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے لیکن فن میں اجتہادِ عمل کا یہ خیال کہ قدیم کی جگہ جدید کی تدریج و تعمیر ہو عمل میں نہیں آتا۔

اسلوب اور ہیئت کے جدید تجربے میں راشد کافی کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جدید نظم میں آزاد اور معریٰ نظم کو رائج کیا۔ اور قدیم ہیئت و اسلوب سے گریز کیا۔ جدید تراکیب بھی وضع کیں' رنگ شب بیداد' 'عشق حاصل خیز' 'شرمیلی سحر' جیسی تراکیب بھی اردو نظم کو عطا کی۔

اس کے برعکس زبان کی نمایاں تبدیلیاں میراجیؔ کی نظموں میں نظر آتی ہے یہ نظموں کے موضوع یا فضا اور ماحول کے لحاظ سے ڈکشن کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

''جیسے دیوی کی مورت ہی جی کو ناچ رہی ہو ناچ
یا بھولے سے، جل پریوں کے جھرمٹ کی رانی دھرتی پر آئی ہو
اور پانی کی لہروں سے ایسے ملتی جائے لہرائے
یا جنگل کی چنچل ہرنی پتوں پر پھسلی جائے
ایک اندھیرے بن کی ناگن پھنکارے اور بل کھائے [۲]

---

[۲] ''دیوداس اور پجاری'' میراجی

''ہوا کے جھونکے ادھر جو آئیں تو ان سے کہنا
ہر اک جگہ دام
دوریوں کا بچھا ہوا ہے
کہ جیسے وہ کائنات کا عکس بیکراں ہے
ہر اک جگہ وقت ایک عفرت کی طرح یوں کھڑا ہوا ہے
کہ جیسے وہ کائنات کا عکس بیکراں ہو
کبھی فریب خیال بنکر کبھی شعور جمال بنکر رشکار کی ناتواں نظر کو
سمجھ رہا ہے ر ہر اک نشاں سے مرا نشاں عدم عیاں ہے
عدم بھی دریوزہ گر ہے میرا، مرے ہی بل پر رواں دواں ہے [۱]

'دیوداس اور پجاری' کی روح ہندوستانی ہے اس میں انھوں نے زبان بھی ایسی استعمال کی ہے جو نظم کی روح سے ہم آہنگ ہے۔ اسکے برعکس 'عدم کا خلاء' کی زبان فارسی آمیز ہے اس نظم میں میراجی نے فلسفۂ حیات پر نگاہ عکس ریز ڈالی ہے اس نظم کے الفاظ وتراکیت اول الذکر نظم سے مختلف ہیں اسکے اسباب یہ ہو سکتے ہیں کہ مزاج ومقام کی مناسبت سے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ دوسری وجہ وطن سے وابستگی ہو سکتی ہے میراجی کی نظمیں وطن پرستی کی انوکھی مثالیں پیش کرتی ہیں بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ میراجی وہ شاعر اول ہیں جس نے محض رسماً ہی حب الوطنی کے گیت نہیں گائے بلکہ انھیں ہندوستان کے ذرے ذرے سے پیار تھا۔ وہ ہندوستان سے محبت ہی نہیں عقیدت رکھتے تھے انکی بیشتر نظمیں خالص ہندوستانی فضا کی عکاسی کرتی ہیں۔ جنھوں نے یہاں کے باشندوں کے مزاج طور طریق اور فلسفہ حیات پر نمایاں اثرات مرتسم کئے ہیں یہ فضا دراصل جنگل کی فضا ہے اور جنگل وحد کے بجائے کثرت کی علامت ہے پہاڑ ندی نالے درخت جھاڑیاں شاخ ٹہنیاں وغیرہ میں جنگل کی

---

[۱] ''عدم کا خلا'' میراجی

یہ فضا تمام متنوع کیفیات کے ساتھ ہندوستانی ماحول کی غمازی کرتی ہے یہ منظر تقریباً ہر نظم میں مل سکتا ہے

میں تو اک دھیان کی کروٹ لیکر
عشق کا طائر آوارہ کا بہروپ بھر دں گا دل میں
اور چلا جاؤں گا اس جنگل میں [1]

پھیلی دھرتی کے سینے پہ جنگل بھی لہلہاتے ہوئے
اور دریا بھی ہیں دور جاتے ہوئے
اور پربت بھی ہیں اپنے چپ میں مگر
اور ساگر بھی ہیں جوش کھاتے ہوئے
ان پہ چھایا ہوا نیلا آکاش ہے
نیلے آکاش میں نور لاتے ہوئے دن کا سورج بھی ہے

اپنی نظم تنہائی میں جنگل کی تصویر کشی یوں کی ہے:-
''فضا میں سکوں ہے
المناک، گہرا گھنا ایک ایک کو گھیرے ہوئے ایک اک
شئے کو افسردگی سے مسل کر مٹاتا ہوا
بے محل نور سے دور۔ پھیلی فضا میں سکوں ہے
اجالے کہ ہر اک کرن جیسے بھٹکی ہوئی ہے
اندھیرے سے بڑھکر اندھیرا ہے۔'' [1]

[1] ''تنہائی'' میراجی

جنگل کی طرف میراجی کا یہ رجحان بعض علامتوں سے بھی واضح ہوتا ہے جیسے 'پیراہن اور پرندہ' پنچھی کا وجود صرف اس بات کی دلالت ہی نہیں کرتا کہ انھوں نے صحرا کی زندگی سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں بلکہ پرندہ کی پرواز اسکی آوارہ خرامی اپنی منزل تک پہونچنے کا جوش ہندوستانی درویشوں اور فقیروں کی مستقل صحرا نوردی کی عکاسی ہے۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا
کیسے دن تھے کیسی راتیں کیسی باتیں گھاتیں تھیں
من بالک ہے پہلے پیار کا سندر سپنا بھول گیا [۱]

میراجی نے ایسی بیشتر نظموں کو اپنے خواب کی حقیقت بنا کر پیش کیا ان کے یہاں کوئی پیغام یا افادیت کا نعرہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جدید ادب کے نزدیک اس ایک شخصیت میں کئی براعظموں کی ادبی تحریکار و خیالات کا اجتماع ہے محمود ہاشمی نے تحریر کیا ہے:-

آج کے جدید ذہن اور عمومی بورژوا معاشرتی فکر کے درمیان جو کشمکس ہے اسی کشمکس کا محور میراجی کی ذات ہے میراجی کی شاعری اسی کشمکش میں اظہار کی علامتی ظفرمندی کو نمایا کرتی ہے مراجی اور جدید ذہن کے درمیان بہ قدر مشترک بظاہر مختصر لیکن اپنے اندرون میں آج کے ذہن آج کی دنیا اور آج کے طرز احساس کی طویل داستاں چھپائے ہوئے ہے۔ [۲۹]

---

[۱] ''رخصت'' میراجی [۲۹] ''تعارف سہ ماہی شعور'' محمود ہاشمی ص ۲۳

آپ ہی آپ میں اڑتے ہوئے طائر کی طرح
بہتے بہتے کسی پانی پہ بسیرا لے کر
جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی پھیلی ہوئی بے جان زمیں کے اوپر
اپنی ہستی کو گرا دیتا ہے [۱]

کوئی پیڑ کی نرم ٹہنی کو دیکھے
لچکتی ہوئی نرم ٹہنی کو دیکھے
مگر بوجھ پتوں کا اترے ہوئے پیرہن کی طرح سیج کے ساتھ ہی
فرش پر ایک مسلا ہوا۔
ڈھیر بن کر پڑا ہے [۲]

میراجی نے جو علامات جنسی احساسات کے اظہار کے لئے پیش کیں انکا تعلق بظاہر فطرت سے زیادہ ہے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فطرت کی پراسرار فضا میں کسی بھی انسانی احساس کو علامت کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے دوسری وجہ غالباً میراجی کا مخصوص مزاج تھا۔ یعنی مظاہر فطرت کے اثرات میراجی کی نظموں میں دو اطوار سے نمایاں ہوتے ہیں۔ پہلا اپنے وطن سے بیکراں عقیدت دوسرا جنسی احساسات کی ترجمانی دونوں مفہوم انکی ایک ہی نظم سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

''جھومی کیسو کی چھایا تو دھیان انوکھا آیا
نٹ کھٹ بندرابن سے ساتھ میں رادھا کو بھی لایا
رادھا مکھ کی اجلی صورت شام گیسو کا سایا'' [۳]

---

[۲] ''اسکی انوکھی لہریں'' [۳] ''ایک منظر میراجی

میراؔجی کی جنسی شاعری بھی اخلاقی پہلو رکھتی ہیں گوانکی اخلاقیات معاشرے کی مروجہ اخلاقیات سے مختلف ہیں یہ روائیتی تصور اخلاق سے انحراف کرتے ہیں ۔ اور ایک ایسے اخلاقی نظام کی تشکیل چاہتے ہیں جوفرد کے جذبات کوقربان کر کے نہ بنایا گیا ہو۔

راشؔد اور میراؔجی کے علاوہ دوسرے جدید شعراء نے جنس کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے ان کی رومانی نظمیں عشق کے روایتی تصور سے گریز کرتی ہیں اسکا سبب عشق کا وہ نیا تصور ہے جوعلم نفسیات سے متاثر ہے حسن عسکری لکھتے ہیں

''نئی شاعری محض ہوس کاری نہیں ہے بلکہ ہر جگہ ایک شدید کشمکش کے نشان ملتے ہیں اور یہ شدت بعض اوقات زیادہ صاف الفاظ استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے ....
ایک طرف پرانی روایات ہیں جو پاک اور غیر جسمانی محبت پر زور دیتی ہے دوسری طرف شاعر کی جنسی خواہش نئی نفسیات ہے جو پاک محبت کو بڑا بے رحمانہ تجزیہ کرتی ہے جسکے نزدیک محبت دائمی نہیں بلکہ وقتی جذبہ ہے نیا شاعر ان دواصولوں کے درمیان لٹکا ہوا ہے'' ۳۰؎

گوجدید شعراء نے تحریکات نفس کے مطالعہ سے یہ نتائج برآمد کیئے کہ عشق کا روایتی مقصد ایک غیر ضروری تصور ہے انھیں تصورات کے پیش نظر انھوں نے جنس کا بے باکانہ تذکرہ کیا اور اسکی بے اعتدالیوں سے باخبر کرادیا جو احساسات کو کچلنے پر پیدا ہوتے ہیں میراجی نے روایتی اخلاقی تصور کے خلاف آواز اٹھائی کچھ اس انداز میں کہ وہ بغاوت ہی نہ ہو بلکہ اس میں خود انکے تقاضے بھی شامل ہوں۔

دراصل میراؔجی سماجی شاعر نہیں ہیں اور نہ ہی سیاسی اور معاشرتی موضوعات

۳۰؎ ''جھلکیاں'' ساقی مئی حسن عسکری

میں دلچسپی لیتے ہیں انھوں نے زندگی گزارنے کا جوشیوہ ختیار کیا وہ حقیقت پسندانہ نہیں بلکہ وہ رومانی ہے ۔ میراؔجی محرومی اور ناکامی سے فرار کا راستہ فطرت کے حسین مناظر میں گم ہو کر تلاش کرتے ہیں

''دور جا بیٹھوں گا ہنگامۂ شور وشر سے
قلب محزوں کو میں تنہائی سے بہلاؤں گا
اس جہاں میں مجھے رسوائی ملی، ناکامی
اس جہاں میں رہا خستہ و خوار و عامی
اس جہاں میں نہ کبھی روح کی بہجت دیکھی
اس جہان میں نہ کبھی راہ مسرت دیکھی
اس جہاں میں نہ کبھی لوٹ کے آؤنگا میں
غیر آباد جزیرے میں چلا جاؤں گا میں [1]

میراؔجی کے اثر سے ہی دوسرے شعراء قیوم نظر مختار صدیقی ضیاء جالندھری وغیرہ نے مناظر فطرت سے استعاروں کی تخلیق کی اور اسکے ذریعہ خوبصورت پیکروں کو تراشنے کا مخصوص انداز پیش کیا۔ میراؔجی کی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ جدید دور کے دوسرے بیشتر شعراء کے یہاں میراؔجی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں میراؔجی نے اردو نظم کو ایک نئے مزاج اور نئے رجحان سے آشنا کرایا۔

---

[1] ''ترک تعلق'' میراؔجی

حالؔی اقبالؔ یا جوشؔ کے برعکس فیض کی شاعری کا آغاز ایک لطیف احساس یا جذباتی حادثہ سے ہوتا ہے یہی حادثہ فیض کی شاعری کا پہلا سنگ میل ہے۔ اور یہی وہ جذباتی دھچکا ہے جس نے فیض کو شعر کہنے پر اکسایا۔ فیض کی نظمیں انکی ذات کے اندر برپا ہونے والے طوفان کی جھلک پیش کرتی ہیں۔ اردو نظم کے کسی شاعر نے محبت کی شدت اور خلوص کو ان جذبات کے ساتھ پیش نہیں کیا۔ جو خلوص فیضؔ نے پیش کیا ان نظموں میں تحریک شعر کی غیر معمولی شگفتگی اور نرمی کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکون کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینہ دل گداز ہو تیرا

فیضؔ کی نظم نگاری دور اول دور آخر میں فتوحات کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن فیض کی محبت ارتقاء کے بعد عالمگیریت میں تبدیل ہو جاتی ہے اب فیضؔ کے روبرو زندگی کے تلخ حقائق ہیں معاشی بے اعتدالیاں ظلم و جبر حرص و ہوس غم والم وغیرہ سے وہ عوام کو ایک نئے معاشرتی شعور سے آگاہ کراتے ہیں اس عمل کے دوران ان کی نگاہوں میں وہ منزل مقصود ہوتی ہے جہاں پہنچ کر نیا انسان عزم نو کے ساتھ حیات نو کی شاہراہ پر آغاز سفر کرے گا۔

فیضؔ کی نظموں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے رومان اور حقیقت کے امتزاج سے انھیں ایک جدید آہنگ عطا کیا جس میں عرفان ذات اور عرفان کائنات کی حدیں ٹوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وصف فیض کو ایک منفرد اور جدید مقام عطا کرتا ہے۔ یہ انوکھا ہنر مجھ

سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' سے شروع ہوکر رقیب سے موضوع سخن' شاہراہ' میرے ہمدم میرے دوست، تک پہونچتا ہے۔ مگر ان منظومات میں فیض اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکے' میرے ہمدم مرے دوست' میں کسی حدتک وہ کامیابی کی طرف ہیں اس نظم میں انھوں نے اک نیا فیصلہ لیا وہ رومانی وحقیقی جذبات کو ایک دوسرے کے نزدیک ہی نہیں لائے بلکہ بہت ہی فنکارانہ انداز سے انھیں ایک دوسرے میں جذب کر دیا۔ یہ اقدام اردو نظم کے لئے قدر جدید تھا فیض سے پہلے رومان وحقائق دو حصوں میں منقسم تھے اور شاعر دو الگ خانوں میں شاعری کیا کرتا تھا مگر فیض نے ان دنوں صورتوں کو یکجا کیا اور قاری کو رمانی خوشگواریوں سے گزار کر حقائق کے تلخ نتائج تک لے گئے اس طرح قاری زندگی کی ناخوشگواریوں سے متعارف ہوکر اسے ایک نئی روشنی میں پرکھنے لگے۔ فیض اس نئی روشنی کی نشاندہی یوں کرتے ہیں۔

''بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اس سیاہی میں رونما ہے
وہ نہر خوں جو مری صدا ہے
اس کہ سایہ میں نور گر ہے
وہ موج زر جو مری نظر ہے'' [1]

رومان سے حقائق تک سفر کو ہی ہم فیض کی بیداری کہہ سکتے ہیں۔ اور یہی عنصر فیض کے سفر شاعری کے نقطہ نظر کا آخری حصہ ہے یہی وہ عنصر ہے جو روشن مستقبل کی امید میں نقش فریادی میں بھی ابھرا تھا فرق یہ تھا کہ نقش فریادی میں موجودہ حقائق کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ لیکن 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' میں فیض بغاوت پر کمربستہ ہوگئے تاہم بغاوت کی یہ روش کسی تدریجی ارتقاء کا نتیجہ نہیں بلکہ نقش فریادی میں ابھرنے والے نظریہ کا ہی پرتو ہے۔

---

[1] ''ملاقات'' فیض

''یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک
اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے
جب تک
اس نطق میں طاقت ہے جب تک'' [۱]

''ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی '' [۲]

جیسا کہ مذکور ہے کہ فیضؔ کی یہ ذوالمعنی آواز اردو نظم کے لئے بالکل نئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس رویہ کی مخالفت بھی کی مگر آہستہ آہستہ فیضؔ کا طریق کار تبدیل ہوتا رہا اور دیگر شعراء ''نقش فریادی' کی اشاعت سے لے کر آج تک ان کے مخصوص طرز تخلیق کی تقلید کرتے رہے۔ لیکن فیضؔ کی شاعری میں ایک انجماد سا آ گیا تھا۔ اور یہی وہ خلا تھا جس نے فیضؔ کی شاعری کو ارتقاء کے بجائے جمود تک پہونچا دیا۔

اس طرح فیضؔ نے 'نقش فریادی' میں جس اجتہادی نظریہ کو اپنایا 'دست صبا اور 'زنداں نامہ' میں بھی وہ اسی کی اظہار و تشہیر پر قائم رہے اس افادی اور انفرادی نقطہ کے تحت ہی انھوں نے اپنے فن کو نکھارا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر فیضؔ کے نظریہ میں کوئی خاص تغیر نہیں آیا اپنے پہلے مجموعہ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہی اظہار بیان معمولی تبدیلیوں کے ساتھ مجموعہ آخر تک قائم رہا۔ وزیر آغا کا خیال ہے

''کسی پیغمبر کی طرح شاعر کا کام یہ نہیں ہوتا کہ کسی

---

[۱] ''صبح آزادی'' [۲] ''دست صبا'' فیض

ایک نظریے کی ترویج واشاعت کے لئے اپنی زندگی
وقف کردے بلکہ اسکا کام یہ ہے حیات وکائنات کے
اسرار رموز کی مسلسل نقاب کشائی کرتا چلا جائے''

پھر بھی فیض کی نظموں میں انوکھا جاذبیت اور قوت ہے جسکی جذباتی سطح جدید
شاعری تک پہونچتی نظر آتی ہے۔

کیفی اعظمی کی مقبولیت اور پسندیدگی کی منزلوں تک رسائی کا ذریعہ انکی نظمیں ہی ہیں انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز و اختتام نظموں پر ہی کیا اس دوران چند غزلیں بھی کہیں لیکن شعری کاوشوں میں نظم ہی ان کی پہچان قرار پائی حالانکہ ان کے دور میں شاعری کے موضوعات نہ صرف محدود تھے بلکہ بڑی حد تک ملتے جلتے تھے ان کے مختلف پہلو ہی دیگر شعراء کے موضوع سخن تھے جن کے شعور مس اجتماعی زندگی کی کوئی گنجائش نہ تھی کیفی نے معاشراتی موضوعات جیسے مفلسی 'غلامی' طبقاتی کشمکش، محنت، آزادی وغیرہ میں انفرادیت رکھی اور اپنے شعری محاسن کو مختلف انداز بخشا فیض احمد فیض نے کیفی کی شاعرانہ عظمت پر یوں اظہار خیال کیا۔

'' کیفی بات ہمیشہ کھری کہتے ہیں جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گردو پیش موجود ہے اس کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلک شعر ہے نہ تلخ مضمون سے گھبراتے ہیں نہ تلخی کلام سے گریز کرتے ہیں۔..................اسکے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور رفند کا ملقوبہ نہیں ہے بلکہ ایکمتوازن ٹہرے ہوئے دردمند فکرانگیز اور حساس نظریہ حیات و فن کا بلیغ اظہار ہے۔''۳۱

ڈاکٹر انور ایرج نے ان کی نظم نگاری پر یوں روشنی ڈالی:۔

'' اردو نظم نگاری کی روایت اور خصویات کی روشنی میں جب کیفی کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو چند باتیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ کیفی کی شناخت غزل سے نہیں نظم سے بنی ہے اور وہ نظم کے بڑے کامیاب شاعر ہیں۔کیفی کی نظر میں شعر و ادب کا ایک واضح مقصد ہے کہ ادب حقیقت سے قریب ہو اور زندگی کا ترجمان بنے۔''۳۲

---

۳۱ ''کیفی کی شخصیت'' فیض احمد فیض ۳۲ ''اردو نظم کی خصوصیات اور اردو شاعری ڈاکٹر انور ایرج نیا دور کیفی اعظمی نمبر جولائی اگست ۲۰۰۲ء

کیفی کی شاعری کا ایک دلچسپ پہلوان پر عائد اعتراضات میں ان پر احتجاج مقصدیت ،خطابت خارجی اثرات' سماجی رجحان اور موضوعاتی اشتعال انگریزی کا الزام صادر کیا گیا اوران کی شاعری کو پروپیگنڈہ اورنعرہ بازی کہ کرنظرانداز کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں تعجب ہے ادب عالیہ میں شمار ہونے والی کامیاب شاعری میں جونکات کمال کادرجہ رکھتے ہیں وہی ان کے یہاں پرعیب ہوگئے شاعری کواوج کمال و رفعت بخشنے میں مزکورہ موضوعات بہت اہم معاون ہوتے ہیں اس بات کاعلم انھیں بخوبی تھا اسی لئے وہ تمام اعتراضات سے بے نیاز ہوکر زندگی سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے رہے ایک نظم[1] :-

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اوران میں بھی وہی اک لمحہ
جس میں دو بولتی آنکھیں
چائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کے دل میں کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یونہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لئے
غم کی سوغات لئے
گرئ جذبات لئے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں

---

[1] '' ایک لمحہ'' کیفی اعظمی

برف پگھلنے ہی لگے !

کیفی اعظمی کی شاعری کا آغاز انھیں رومان انگیز حسین رنگین وادیوں میں ہوا تھا احتیاط پشیمانی ، مجبوری ' ملاقات تصور اندیشے ، نقش ونگار اور ایسی ہی بیشتر نظمیں آج بھی جدید شاعری کا کوورثہ ہیں جو اپنی دلکشی ،خوابنا کی اور تاثر کے بناپر اردو کی بہترین نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں ۔ دیگر شعراء کی طرح کیفی بھی رومان سے انقلاب کی جانب متوجہ ہیں ۔

درحقیقت کیفی اعظمی کی شاعری میں ملک کی سیاسی معاشرتی اور معاشی زندگی کا کافی وسیع پس منظر ہے جس میں وہ عام لوگوں کے ساتھ اپنی آواز ملانے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں یہ سماجی شعوران شاعری کا خاصہ ہے گزرے ہوئے لمحوں کی ہر آواز انھیں ازبر ہے جسے وہ پورے تاریخی شعور کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔

۶ ردسمبر ۱۹۹۲ کا سانحہ ہونے پر وہ درد سے کراہ اٹھے وہ اس لئے نہیں چیخے کہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان نے بہایا تھا قتل وغارت گری اب انسانی سرشت بن چکی ہے بلکہ وہ ان حالات چیخ اٹھے کہ بھگوان رام کے دیس میں خود بھگوان رام کے نام پر انسان کو قتل کیا جارہا ہے کیفی نے ان احساسات کو رام کو دوسرا بنواس نام دیا نظم قابل مطالعہ ہے :-

رام بنواس سے لوٹ کر جب گھر میں آئے
یاد جنگل بہت آیا جو نگر میں آئے
رقص دیوانگی آنگن میں جو دیکھا ہوگا
چھ دسمبر کو شری رام نے سوچا ہوگا
اتنے دیوانے کہاں سے مرے گھر میں آئے
جگمگاتے تھے جہاں رام کے قدموں کے نشاں
پیار کی کہکشاں لیتی تھی انگڑائی جہاں

موڑ نفرت کے انھیں راہ گزر میں آئے
دھرم کیا انکا ہے کیا ذات ہے یہ جانتا کون
کچھ نہ جلتا تو انھیں رات میں پہچانتا کون
جلتی مشعل لئے جو لوگ نظر میں آئے
شا کا ہاری ہیں مرے دوست تمہارے خنجر
تم نے بابر کی طرف پھینکے تھے سارے پتھر
ہے مرے سر کی خطا زخم جو سر میں آئے
پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے
کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے
پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اٹھے
رام یہ کہتے ہوئے اپنے دوارے سے اٹھے
راجدھانی کی فضا آئی نہ راس مجھے
۶ ردسمبر کو ملا 'دوسرا بنواس' مجھے [۱]

نظم گو طویل ہے پر ایک ہی نظم کیفی کے ذہن ومزاج تفکرات اور اظہار و بیان کی قوت کو خوب اجاگر کرتی ہے کیفی کے مطابق رام کو دوسرا بنواس لینا پڑا عجب اتفاق ہے کہ دس سال بعد کچھ ویسے ہی حالات پھر رونما ہوئے سوتے گجرات میں پھر رام کے نام پر انسانی خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی اور کیفی 'رام کو ایک اور بنواس کے منتظر تھے انسانیت سے وابستگی کا یہ جذبہ ہمیں کیفی کے کلام میں جا بجا دکھائی دیتا ہے دائرہ، آخری رات' اور غارت' جیسی نظموں میں ایک شدید احساس بے بسی فکر وشعور پر حاوی ہے آخری رات میں خوسپردگی اور بے چارگی کا یہ عالم ہے۔

---

[۱] ''دوسرا بن واس'' راشٹریہ سہارا امنگ مئی ۲۰۰۲ء

کوئی کہتا تھا ٹھیک کہا تھا
سرکشی بن گئی ہے سب کا شعار
قتل پر جن کو اعتراض نہ تھا
دفن ہونے کو کیوں نہیں تیار
ہوشمندی ہے آج سو جانا
آج کی رات ہم کو سونے دو[۱]

عبادت میں یہی خودسپردگی اور بے بسی ماضی و حال سے گزرتی ہوئی یوں زہرناکی میں تبدیل ہوتی ہے۔

مدتوں میں اک اندھے کنویں میں اسیر
سر پٹکتا رہا گڑگڑاتا رہا
روشنی چاہئے، چاندنی چاہئے، زندگی چاہئے
روشنی پیار کی، چاندنی یار کی، زندگی وار کی
اپنی آواز سنتا رہا رات دن
دھیرے دھیرے یقیں دل کو آتا رہا[۲]

کیفی کی شاعری میں ایسی بہت سے نظمیں ہیں جن کے موضوع زیادہ نئے نہیں لیکن شعری اظہار و بیان میں جمالیاتی اقدار کا بھرپور تاثر قائم ہے۔ان کے یہاں نہ مشکل الفاظ کا گزر ہے اور نہ ہی ابہام و ایہام کی گنجائش لیکن استعاروں کی زبان انھیں خوب آتی ہے جس کے استعمال سے انھوں نے اپنی نظموں کو آراستگی بخشی ہے۔
۱۹۷۴ میں کیفی کے تیسرے شعری مجوعے' آوارہ سجدے' کے فنی شعور میں

---

[۱] '' آخری رات '' ''عادت'' کیفی اعظمی

غیر معمولی تخلیق صلاحیت نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ انھیں اس ایک مجموعہ کلام پر چار ایوارڈ ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ، اتر پردیش اردو اکاڈمی ایوارڈ، مہارراشٹر اردو اکاڈمی ایوارڈ سویت لنڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسکے علاوہ درجنوں ایوارڈ انکے تخلیقی کارناموں پر عطا کئے گئے جو ان کی صلاحیت اور قابلیت کے علمبر ار ہیں۔

کیفی وہ مجاہد شاعر تھے جو نفرت عداوت ظلم تعصب اور فرقہ واریت کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے ان کی نظم کے یہ مصرعے فضا کی بازگشت بن چکے ہیں:-

ایک مجاہد ادیب
زندگی کے لئے
جو مشیت سے لڑتا رہا
لڑتے لڑتے وہ اک روز چپ ہوگیا
اپنے ہی اک صحیفہ سے منھ ڈانپ کر سو گیا
لیکن اسکا قلم

....

لڑ رہا ہے اسی ڈھنگ سے آج تک
جل رہا ہے اسی ڈھنگ سے آج تک
گاہ اس ہاتھ میں
گاہ اس ہاتھ میں [1]

دراصل کیفی گفتار و کردار دونوں کے غازی تھے بلا شبہ مرحوم مخدوم محی الدین کے بعد صرف اور صرف کیفی آعظمی کو ان کی شخصیت یہی دو پہلو شعراء سے انھیں ممتاز اور منفرد

---

[1] '' دوسرا طوفان'' کیفی اعظمی

بناتے ہیں۔ جاوید یوسف کی یہ نظم ان کی اس منفرد شخصیت کی صحیح معنوں میں عکاس ہے۔

کیف وسرور

رنگ وفا

اور انقلاب

تیرا کلام

کتنے ہی رنگوں کا امتزاج

لہجے میں وہ جلال

کہ بیدا ہو گیا

محنت کشوں کا سویا ہوا

سوختہ سماج

موج صبا سے ہوتی رہی

گفتگو تری

آب رواں سے تو نے کیا

بے ساختہ کلام

تیرا مزاج

آئینہ امکان بن گیا

اک عکس بے مثال

مہکتا ہوا گلاب [۱]

---

[۱] ''لہجہ میں وہ جلال'' جاوید یوسف نیا دور ص ۴۳

تغیرات زمانہ نے زندگی سے متعلق شعبے اور حلقہ کو متاثر کیا جسکا ایک اہم حصہ ادب ہے۔ ادب چونکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اور اسکے اظہار کا ایک موثر وسیلہ ہے لازم ہے کہ وہ ان تغیرات سے متاثر بھی ہوگا کبھی اقتضائے زمانہ کے تحت اور کبھی تقلید زمانہ کی خاطر یہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں روز بروز رونما ہونے والے حالات روایتی اقدار کی تحدید سے گزرتے گئے۔ ادب بھی ان حد بندیوں میں محدود نہ رہ سکا۔ اور آہستہ آہستہ قدیم روایت کی یہ بندشیں بکھرنے لگیں۔ جس میں شعراء بھی ترقی پسند مضیفن کے مقام سے گزر کر ارباب ذوق سے متاثر ہوتے ہوئے جدید ترین نظریات کے حامل ہو گئے۔ جو ایک آزاد ماحول میں آزادنہ بے باکانہ اور اکثر گستاخانہ لہجہ اپنانے پر مجبور ہو گئے۔

جدید ادبی شعور میں ''شاعری اور فکشن'' ایک اہم موضوع ہے جدید شاعری میں فکشن کی مخصوص حد بندیاں اپنا وجود رکھتی ہے حالانکہ فکشن کی بحث نثر کے حوالے سے زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ کیوں کہ ادیب منطق کا سہارا لیتا ہے اور منطق سے نثر جب کوئی نثری تخلیق فکشن کی حد میں داخل ہوتی ہے تو اس میں یکا یک تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں

شاعری کے مختلف اصفاف حد بندیوں کے باوجود کچھ مشترک وصف کی حامل ہیں مگر شعر کی یہ حد بندیاں بھی محفوظ نہیں رہتی عموماً مسجع اظہار میں مفصل بیان ثانی حیثیت رکھتا ہے بیانیہ میں لب ولہجہ کی رسائی ایک عام سطح تک ہوتی ہے نظم نگاری جو عموماً آرائشی لب ولہجہ کی اسیر تھی فکشن نے ٹھوس تفصیل کی اہمیت سے شعراء کو آگاہ کیا جدید تر نظم اسی ٹھوس تفصیلی علامتی اور استعاراتی استعمال سے ہی بلند سطح تک نظر آئی۔ اس تبدیلی کی بہتر مثالیں خلیل الرحمٰن اعظمی، ظفر اقبال، ناصر کاظمی، منیر نیازی، ساقی فاروقی، شہریار، شمس الرحمٰن فاروقی اور محمد علوی وغیرہ کے یہاں نظر آتی ہیں :-

'' چاندکی مگر روشنی

شب کے بام ودر روشن
اک لکیر بجلی کی
اور رہگزر روشن
اڑتے پھرتے کچھ جگنو
رات ادھر ادھر روشن'' [۱]

''میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سایہ کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلاء ہی خلا ہے'' [۲]

''میں اپنے خول کے اندر سمٹ کر بیٹھ رہنا چاہتا ہوں
مجھے مینار کی کھڑکی سے جھک کر جھانکنے کی بھی ضرورت کچھ نہیں ہے'' [۳]

آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہو گیا
ہو مبارک آرزوئے خاروخس پوری ہوئی'' [۴]

نظموں میں فکشن کا اثر غیر ذاتی طرز اظہار کے انداز میں بھی ظاہر ہوا بظاہر نظمیں مکالمہ نگاری تفصیل نگاری اور ڈرامائی طریق سے عمل اور رد عمل کی شکل سے وجود میں آئی

---

[۱] محمد علوی [۲] خلیل الرحمٰن اعظمی [۳] شمس الرحمٰن [۴] شہریار

ہیں لیکن پوری نظم علامتی، استعاراتی اکائی اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہی وصف اس میں نمایاں ہوتا ہے جدید نظموں میں نقش گری اور تشبیہ سازی پر زیادہ توجہ ہے اسکی بہترین مثالیں ہمیں عمیق حنفی اختر الایمان، وزیر آغا، باقر مہدی اور خورشید الاسلام، عادل منصوری کے یہاں نظر آتی ہیں۔

'' خموشی کے اس زرد لمحے سے پہلے
یہ محسوس ہوتا ہے جیسے
کوئی غم زدہ بے نشان چاپ رک سی گئی ہے
تو لاکھوں بپھرتے قدم ان گنت تند دھارے
جو دبکے پڑے تھے
عقب سے ابھر کر
مری سمت تیزی سے بڑھنے لگے ہیں [1]

''بوسوں کے پھول لمس کچھ خوشبو روش روش
سبزہ تمام شام ملاقات ہی میں تھا

وہ کون تھا جو دن کے اجالے میں کھو گیا
یہ چاند کس کو ڈھونڈنے نکلا ہے شام سے

جدیدیت کی تلاش میں شعر کی حد بندیوں پر کاری ضرب لگی ہے جس سے آہنگ کا تصور کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا اور نظم کو بحر وزن اور عروض سے جدا کر کے دیکھنے کا نظریہ سامنے آیا اور اس خیال کو پختگی ملی کہ لفظ بذات خود ایک انفرادی آہنگ ہے نثری ترتیب میں بھی

---

[1] وزیر آغا

وہ شعری آہنگ کا حقدار ہوسکتا ہے۔ جدید نظریات نے یہ ثابت کر دیا کہ جملوں کی ترتیب اور پیراگرافوں کی تزئین بھی وہی رنگ و آہنگ پیدا کر سکتی ہے جو روایتی نظموں اور غزلوں میں پایا جاتا ہے یہ بات اور ہے کہ ہر نثری نظم شعر کے مقابل نہیں ٹھہرتی لیکن وہ نظمیں جو استعاراتی اور علاماتی اوصاف رکھتی ہیں وہ بلاشبہ شعری تخلیقات کا مقام حاصل کر لیتی ہے اور انکا باطنی آہنگ تاثر آمیز ہوجاتا ہے۔ اس طریق کار کو اپنانے والوں میں چند نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جسمیں صلاح الدین پرویز، احمد ہمیش، عمیق حنفی، خورشید الاسلام، منیر نیازی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
تو جنگل میں رکتے
اداسی کے جاڑے میں سوکھے درختوں کی کچھ ٹہنیاں توڑ لیتے
بدن کی انگیٹھی سے کوئی جلا ادھ بجھا کوئلہ توڑ لیتے [۱]

کسی سایے کا نقش گہرا نہیں ہے
ہر ایک سایہ اک آنکھ ہے
جس میں عشرت کدوں نارسا خواہشوں
ان کہی داستانوں کا میلا لگا ہے
مگر آنکھ کا سحر، پلکوں کی چلمن کی ہلکی سے جنبش ہے
اور کچھ نہیں ہے
کسی آنکھ کا سحر دائم نہیں ہے [۲]

چاند کو باہر فلک پر چھوڑ کر

وقت کی اندھی گپھا میں
دور اندر پہونچ
آگ کے اور روشنی کے آبشاروں میں نہاتا ہوں
اور اسی رشتے سے باہر آن کر
چاند کی گردن میں اپنا ہاتھ ڈالے
انجمن تا انجمن آوارگی کا لطف لیتا ہوں
نیم شب کو عیش بستر چھوڑ کر [۳]

وزیر آغا فکشن کی حد بندیوں میں اصطلاح کی حد بندیوں کو ناپسند کرتے ہیں جس میں استعاراتی وابستگیاں بھی ہوتی ہیں اور علامتی دلچسپیاں بھی ہیں انکی نظم ترغیب :-

'' کبھی تم جو آؤ
تو میں ایک تپتی ہوئی دوپہر میں
تمہیں اپنے اس آہنی شہر میں لے چلوں
ایک لوہے کے جھولے میں تم کو بٹھاؤں
تمھیں سب سے اونچی عمارت کی چھت سے دکھاؤں
ملوں کا سیہ رنگ
تنگ گلیوں سے رستی ہوئی نالیاں
جو مساموں کی صورت
مکانوں کے جسموں سے گاڑھے پسینے کو خارج کریں
کھانستی سسکتی ہوئی شاہراہیں
ہراساں ٹیکسیاں

---

[۱] صلاح الدین پرویز [۲] ''سائے'' منیر نیازی [۳] عمیق حنفی

پرانے گرانڈیل پیڑوں کے لٹنے کا منظر
شکستہ عمارات کی ہڈیوں پر
مڑی چونچ والے سیہ فام بل ڈوزروں کے جھپٹنے کا وحشی سماں
کبھی تم جو آؤ
تو میں تم کو پلکوں پہ اپنی بٹھاؤں
تمھیں اپنے سینے کا منظر دکھاؤں'' ۱؎

فکشن میں کردار ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ لیکن جدید نظم اب اپنی ساری حد بندیوں کو توڑ چکی ہے رفتہ رفتہ نظموں میں بھی کرداروں کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اخترالایمان کی نظمیں اسکی شاہکار مثالیں ہیں منیر نیازی کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں:-

''پر اسرار بلاؤں والا
سارا جنگل دشمن ہے
شام کی بارش کی ٹپ ٹپ
اور مرے گھر کا آنگن ہے
ہاتھ میں اب ہتھیار نہیں ہے
باہر جاتے ڈرتا ہوں
رات کے بھوکے شیروں سے
بچنے کی کوشش کرتا ہوں'' ۲؎

زاہدہ زیدی کی نظمون میں بھی باطنی خوبصورتی وجود کی کشمکش اور فنی عبارت کی

۱؎ ''ترغیب'' وزیر آغا ۲؎ ''جنگ میں زندگی'' منیر نیازی

مثال ہیں ان کی نظموں نے بھی روایتی حد بندیاں جا بجا منہدم نظر آتی ہیں ۔ فکشن سے متاثر تبدیلیوں میں غیر رومانی طرز اظہار صنائی Structural Charecter یعنی کردار نگاری، نقش گری خود کلامی اور جا بجا پلاٹ کا استعمال جدید منظوم نگاری کے اہم تغیرات ہیں ۔

باب دوم

ترقی پسند تحریک کی شعریات حالی کے شعری فارمولے سے لیکر کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت کے زیر اثر پروان چڑھی ادھر حالی وآزاد نے افادیت اور مقصدیت کو شاعری کا اصل مقصد قرار دیا حالانکہ ترقی پسندوں کے نزدیک زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانا انداز میں پیش کر دینا ہی شاعری تھی ساتھ ہی بعض فنکار کے طریقۂ اظہار رومانی اور جذبہ میں خلوص تھا۔ زندگی کے مسائل کا اظہار جذباتی انداز میں کیا کرتے تھے اور حقیقت پسندانہ ٹکنیک کا سہارا نہیں لیتے تھے اسکے برعکس حلقہ ارباب ذوق نے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے بجائے انفرادی اہمیت کو سمجھا اور شاعری کو انفرادی شخصیت کا اظہار قرار دیا۔ انفرادیت اور موضوعیت حلقہ کے خاص مقاصد تھے جن کو اس دور کے تمام شعراء پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک شاعری محض تقلید یا پیروی ہی نہ تھی بلکہ ایک تخلیق عمل ہے کیونکہ تخلیق جب جب ہوئی ہر بار اپنے نئے وجود کے ساتھسامنے آئی اور اسکی تراکیب کے زاویہ تبدیل ہوتے گئے اس حلقہ نے شعری محاسن کو شاعری کی بنیادی قدر قرار دیا لیکن موضوع اور مواد کے قائل رہے۔ میراجی اور راشد کے تصورات بھی انھیں موضوعات کے تحت ابھرتے رہے۔

اس نظریات سے عبوری دور کے بعد ۸۰ء کی جدید نسل کے شعراء نے اتفاق کیا اس نسل کے اکثر ادیب تجربہ سے وابستگی کو اپنی تخلیقی قوت کے لئے ضروری سمجھتے تھے انھوں نے زوال پزیر تہذیبی اور معاشی قدروں کا جائزہ لیا۔ اور طبقاتی پسماندگی اور معاشی صورت حال کا بہت ہی کرب کے ساتھ اظہار کیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اس دور کی شاعری کی خصوصیات کو یوں واضح کرتے ہیں:-

> ''اس مقررہ نظریوں خانوں فارمولوں اور نعروں سے دامن چھڑا لیا۔ اور کسی وقتی اور ہنگامی مسلک یا نصب العین سے وابستگی کے لئے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں کر سکا۔ اس نے ان

۳۳؎ ''جدید تر غزل'' خلیل الرحمٰن اعظمی مضامین نو ص ۴۷

لکیروں اور پلوں کو توڑ دیا ہے اور زندگی کے ناپید کنار سمندر
میں داخل ہو گیا ہے'' ۳۳

جدید ادیبوں کے ذریعہ جدیدیت سے وابستہ نئی شعری جمالیات کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن اس دور کی نئی شعریات پر تمام جدید ذہنوں کے شعراء متفق بالرائے نہیں ان میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے جو محض انفرادی نہ تھا۔ بلکہ یہ بنیادی طور پر دو نسلوں کا اختلاف تھا۔ اس اختلاف کے باوجود انھوں نے جدید شعریات کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان حضرات نے موضوع کے اظہار اور ادراک میں فنکار کو مکمل آزادی دی ہے اسی آزادی سے جدید ترین شعریات کا آغاز ہوتا ہے حلقہ ارباب ذوق نے فنکار کو مکمل آزادی دینے کی کوشش کی لیکن عملی طور پر وہ بھی چند عقائد و تصورات کے پابند ہو کر رہ گئے جلد ہی ان کے نظریات میں تغیر آیا۔ اور آزادی کی تحدید نہ رہی یہی انفرادی تصور قائم رہا جدید دور کے فنکاروں نے غیر محدود آزادی کی خواہش کے زیر اثر ایک نیا شعری اصول ہی ترتیب نہ دیا بلکہ شاعری کی تعریف بھی جدید انداز میں پیش کی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔

''وہ (نیا شاعر) شاعری کو اجتماعی خیالات کا منظوم بیان
نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے زندگی کے تجربات و مشاہدات کا ایسا
تخلیقی اظہار سمجھتا ہے۔ جو اسکی اپنی شخصیت اور اسکے
محسوسات سے ہم آہنگ ہو کر ایک منفرد پیکر اختیار کر لے وہ
شاعری کو جماعتی کورس کے بجائے انفرادی تخلیقی عمل سمجھتا ہے۔ ۳۴

نئے شاعروں کے بیان انفرادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی کو ایک مکمل اکائی کی صورت میں پیش کیا گیا۔ جس میں داخلیت، وخارجیت، ذات و کائنات، غم جاناں، وغم دوراں کے موضوعات ان سب کی تقسیم یا علاحدگی کو نیا شاعر ناپسند کرتا ہے بلکہ ان کے اختلاط کا

---

۳۴ ''نئے شعری رجحانات'' خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۶۵

قائل ہے فرد اور معاشرے کے گہرے ربط کو لازم قرار دیتا ہے۔ وحید اختر نئی شاعری کی طرف اس پیرایہ میں اشارہ کرتے ہیں۔

''جدید ادب حقیقی زندگی برتنے کا نام ہے''

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے کلیدی مضمون 'شعر غیر شعر' اور نثر میں شاعری کی تعریف تعین کرتے ہوئے موزونیت اجمال جدلیاتی کا استعمال اور ابہام کو شاعری کا اصل اصول قرار دیا ہے۔ انیس اشفاق کا خیال ہے:-

''نیا شاعر اس وقت تشویش اور خطرے کی فضا سے دو چار ہے اور مصائب حق تلفی اور محرومی کا شکار۔ وہ چاروں طرف سے مخالف اور ناسازگار فضا میں گھرا ہوا ہے مزاحم قوتیں اسے روز بروز ہتھیا ڈالنے پر مجبور کر رہی ہیں'' ۳۵

دور حاضر کے شعراء کا اصل مسئلہ فنکار اور تخلیق کے درمیاں ایک ربط ضبط کا آغاز تھا۔ اسکی تلاش میں ان حضرات نے ترقی پسندوں اور حلقۂ ارباب ذوق کی شعری روایات سے انحراف کیا۔ اور شاعری کا ایک ایسا تصور پیش کیا۔ جو پچھلے شعراء سے منفرد اور جدید ترین تھا۔

۱۹۷۰ء کے مابعد شعراء نے قدماء کو اہمیت تو دی لیکن شعراء ادب ہر نکتہ چینوں کے ساتھ موضوع کی اہمیت سے انکار کیا۔ اور اسے غیر ادبی معیار قرار دیا۔
شمش الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے۔

---

۳۵ ''ادب کی باتیں'' انیس اشفاق

"شعر پر کھنے اوراس میں شاعری کے عنصر کے پہچاننے
اور الگ کرنے کے لئے موضوع کی قید نہیں لگائی جاسکتی۔
یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں شعر میں شاعری نہیں چونکہ
اسکا موضوع غیر شاعرانہ ہے" ۳۶؎

اس قتباس سے یہ ایک واضح تصور شعر ہمارے سامنے ابھر کر آجاتا ہے کہ شاعری کی شناخت کیلئے موضوع کا معیار اہم نہیں ہوتا۔ مگر جدید شعراء انفرادی تجربے اور احساس کے اظہار کو اہمیت دیتے ہیں۔ جدید ترین نظریات کے بعض حاملین موضوع کی معنویت کو رد نہیں کرتے۔ بلکہ محض روایتی ادبی معیار کو پیش نظر رکھکر شاعری کو پرکھنے کے خلاف ہیں۔ اس حقیقت کو افتخار جالب نے واضح کیا ہے۔ ان کا خیال ہے۔

"نئے اور عظیم موضوعات کی پیش کش نہایت اہم رہی ہے
اس روش نے لسانی تشکیلات کے کو درخور اعتنا سمجھتے ہوئے
موضوع اور صیغۂ اظہار کے علاوہ علاحدہ فاصلہ قائم کئے" ۳۷؎

جدید شعریات کی تربیت وتزئین میں شمس الرحمٰن فاروقی اور افتخار جالب نے اہم رول ادا کیا ہے ان حضرات نے شاعری کے جس اصول کو مرکزی حیثیت دی ہے وہ شاعری میں تجربے اور احساس کا اظہار ہے لیکن شعریت کا پیمانہ موضوع یافتہ نہیں نئے شاعروں کی اکثریت نے براہ راست معاشرے اور فرد کو موضوع بنایا۔ یہ وہ معاشرہ تھا۔ جس میں صنعت وتجارت کو فروغ دیا جارہا تھا۔

جدید زندگی میں مادیت پرستی کا رجحان سائنس کی دین ہے سائنٹفک ایجاد سے اب ہم متحیر نہیں ہوتے بلکہ کچھ اور کر گزرنے کے منتظر ہوتے ہیں زندگی تو متلاشی رہتی ہے

۳۶؎ "شعر، غیر شعر اور نثر" شمس الرحمٰن فاروقی ص ۲۴ ۳۷؎ "لسانی تشکیلات" افتخار جالب کی نئی شاعری ص ۲۴۷

جدید سے جدید ترین اقدام کے لئے لیکن سائنس کی ایجادات کے سبب ہم روحانیت کھو چکے ہیں وہ روحانیت جس سے مادی زندگی میں حرارت تھی مشرقی زندگی کی روحانیت روز بروز ختم ہوتی جارہی ہے۔ اسکے اقدار آہستہ آہستہ بکھرتے جارہے ہیں۔ اس مادیت پرستی کی زد میں مشرقی تہذیب مشرقی قدریں دم توڑ رہی ہیں اور انسان بے بس مجبور ہے۔ کیوں کہ وہ اقدار کے سہارے زندگی گزارنے میں خود کو بے سروپا محسوس کرتا ہے۔ اور اسی بے بسی اور لاچاری کو محمد علوی نے شعری احساسات کے پیکر میں یوں بیان کیا ہے۔

کبھی دل کے اندھے کنویں میں
کبھی دوڑتے خون میں
تیرتا ڈوبتا ہے کبھی ہڈیوں کی سرنگوں میں بتی جلا کر
یوں ہی گھومتا ہے
کبھی کان میں آ کے
چپکے سے کہتا ہے، تو اب تلک جی رہا ہے؟
بڑا بے حیا ہے:-
مرے جسم میں کون ہے یہ
جو مجھ سے خفا ہے''[۱]

دراصل نوع انسان ایک میکنکل دور سے گزر رہا ہے جہاں جنسی ابہامیت مقامیت قبایلیت اور فرقہ پرستی کا زور اثر بڑھتا جاہا ہے۔ اس دور کے تقریباً تمام شاعروں کے یہاں کسی اہم شئے کو کھودینے کا احساس ہے وحید اختر اسے خواب اور اقدار کا نام دیتے ہیں زندگی سے فرار داخلیت ماوارئیت پر اسراریت طبقائی کشمکش تجریدیت' اجنبیت شکست' ذات'

---

[۱] '' کون'' محمد علوی

تنہائی نعرہ بازی، بلند آہنگی، فارمولہ بازی اور ادعائیت وغیرہ انکے پسندیدہ موضوع ہیں ان کی نظموں میں بیک وقت بے اطمینانی اور زندگی سے فرار حاصل کرنے کی خواہش نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کی حق تلفیوں کا شکوہ بھی کرتا ہے۔ اور اس سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے بلراج کومل کے شعری احساس قابل ملاحظہ ہیں۔

''گھروں کی رونق

یہ زرد بچے

یہ گھر بنائیں گے، یہ شادیانے بجائیں گے آنے والے رنگین دنوں کی خاطر

یہ چند لمحوں کو زندگی کا مآل سمجھیں گے حسب دستور

عمر بھر ان کو انگلیوں پر گنا کریں گے

یہ میرا حصہ

یہ تیرا حصہ

پھر ایک دن یہ بھی زرد بچوں کے باپ ہونگے

اور ان کی خاطر دعا کریں گے

دراز ہو ان کی عمر دیکھیں یہ سو بہاریں [۱]

انکا خیال ہے جن اقدار کی تلاش میں ہم سرگرداں ہیں وہ ہمیں خواب میں نظر آتے ہیں۔ شاعر سامان دل بستگی کو عشرت کدوں اور محفل طرب میں تلاش کرتا ہے۔ لیکن وہاں تک رسائی نہ ہونے تک مایوسیوں تنہائیوں کھوکھلی آوازوں اور مہیب سناٹوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ انھیں اقدار کا سہارا چاہتا ہے۔ جو برسوں پہلے عام زندگی سے ختم ہو چکی تھیں تہذیب قدریں اقتضائے زمانہ کے ساتھ تغیر پذیر ہوسکتی ہیں۔ مگر ان کو یکسر فراموش کر دینا ناممکن ہے۔ یہ کسی نہ کسی نام سے کسی نہ کسی زاویہ سے ہر دور کی مانگ رہی ہیں۔

---

[۱] '' یہ زرد بچے '' بلراج کومل

(۷۷)

زخمی سورج نے جب آنکھ کھولی یہاں
خنجروں کی چمک، سے وہ اندھا ہوا
بے یقینی کے بادل گرجنے لگے
گھر سے نکلے تو گھر کا نشاں مٹ گیا
روح اور جسم کا سلسلہ مٹ گیا
ہاتھ اٹھو جو دعا کے لئے کٹ گئے

....

اب نہ در ہے نہ دیوار ہے درمیاں
اور زمیں پاؤں رکھنے کے قابل کہاں
آنسوؤں سے سرابوں کو بھرتے چلو
دشت ہجرت کو سیراب کرتے چلو [۱]

اگر ہم جدیدیت کے ابتدائی دور کے رسائل اور شعریات کا جائزہ لیں تو شعراء وادباء کی ایک ایسی فہرست تیار ہوتی ہے۔ جو خود کو جدید کہتے ہیں یا جدیدیت کا بانی سمجھتے ہیں۔ان میں سے اکثر حوصلہ شکست ہو گئے اور کچھ مشینی انداز میں شاعری کرتے رہے ۱۹۷۰ء کے بعد کے شعراء میں جن حضرات نے اپنا مقام متعین کیا۔ ان میں کمار پاشی ، اور عمیق حنفی ،قاضی سلیم وغیرہ جو جدید ترین شعراء کی صف میں اولعیت کے حامل ہیں۔مگر انکا تخلیقی عمل جمود کی نذر رہور ہا ہے۔ وزیر آغا، ساقی فاروقی ، زاہد ڈار، باقر مہدی ، بلراج کومل، محمد علوی، ندا فاضلی نے قابل داد تخلیقات پیش کی ہیں لیکن شاید یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ انکا تخلیقی ارتقاء بھی ایک مخصوص معیاری سطح تک پہونچ کر ساکت ہو گیا۔ دور حاضر میں جدت پسندی کا رجحان اتنا شدید رہا کہ اسکے زیر اثر خواہ اعلیٰ پیرایہ میں شاعری نہ کی گئی ہو لیکن جدیدیت اور انفرادیت کو ملحوظ

---

[۱] ''زخمی سورج نے جب آنکھ کھولی یہاں'' عادل منصوری

نظر ضرور رکھا گیا۔ جدید ترین شاعر حسن آثر کی یہ نظمیں بطور مثال پیش ہیں

شام کی
سادگی پر
شاہراہوں
میں
سب
قمقمے
احمقوں کی طرح
ہنس پڑے [۱]

کچھ کہا نہیں
کچھ سنا نہیں
کچھ لکھا نہیں
کچھ پڑھا نہیں
کچھ لیا نہیں
کچھ دیا نہیں
پھر بھی تم
پھر بھی ہم
ہو گئے اسیر غم [۲]

---

[۱]، [۲] حسن اثر

ان منظومات میں حالانکہ شعریات کا کوئی بھی جز ونظر نہیں آتا۔ پھر بھی معنی ومفہوم کے اعتبار سے ایک پوری نظم کا وزن اور وقار رکھتی ہے۔ اس نوعیت کی نظمیں دیکھ کر بھی کبھی یہ خدشات ابھرنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ جدیدیت کی حد تو نہیں۔ الفاظ محو ہوتے جارہے ہیں جدید ترین نظریات اگر اسی شدت سے تبدیل ہوتے رہے۔ تو وہ زمانہ دور نہیں جب شعراء صرف چند لائنوں کے وسیلے سے اپنے خیالات عوام تک پہو جائیگا۔ اور قاری بخوبی اسے قبول کریں گے۔

''کھلی آنکھوں سے منظر دیکھتا ہوں
میں خود کو اپنے اندر دیکھتا ہون
میں اب باہر نہیں
گھر کے اندر رہ رہا ہوں'' ۱

''مت چلو ننگے پاؤں
چھالے پڑ جائیں گے
گھاس پر شبنم نہیں آنسو ہیں
آسمان کے'' ۲

''مائل بہ کرم ہیں یہ راتیں
آنکھوں سے کہو اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں'' ۳

۱، ۲ ساحل احمد ۳ شہریار

جدیدیت کی تلاش میں ہمارے شعراء تخلیقی ارتقاء میں اپنے فن کے ایک نئے درجہ حرارت کو بروے کار رلاتے ہیں جس میں توانائی وناز کی تہہ داری ، حسن کاری اور کائناتی آہنگ کے ساتھ ساتھ اپنے عہد تصادم کے اثرات کا انعاس بھی ہوتا ہے۔

''یہ ساحل پہ بکھری ہوئی پیاس
ترسی ہوئی ریت،
سیپی کی لاش
اور آبی پرندوں کے ٹوٹے ہوئے نرم پر
یہ تھکن دائمی
اور اخبار میں
ایک ازلی خبر............خودکشی
ایک تصویر.............جلتا ہوا آدمی
اور لہروں کی نوحہ گری'' [۱]

ساقی فاروقی کی یہ نظم جدید پیکر میں معاشرتی نظام کی ابتری اور اسکے تصادم کی زبان حالی ہے ساقی فاروقی نے بحثیت جدید شاعری میں فکر واحساس کے نئے نئے پہلو دریافت کئے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے ایک خط میں ساقی فاروقی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''تم نے اپنے عہد کی شاعری کی ہے اور تازہ تر لہجے کی
دریافت تخلیقی طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے نئی شاعری

---

[۱] ''ساحل کی ایک شام'' رادار ساقی فاروقی

کی ہوس میں نفی کرنے یا کسی فارمولے کو اوپر سے اوڑھنے
کی کوشش نہیں کی۔ تمہاری نئی شاعری کسی سنہ کی شاعری نہیں
جو سنہ بدلنے کے بعد باسی معلوم ہوگی بلکہ یہ زندہ اور تناور
درخت کی طرح ہے جسکی جڑیں نیچے تک چلی گئی ہیں۔'' ۳۷

تمہاری شاعری کسی سنہ کی شاعری نہیں، یہ جملہ صرف ساقی فاروقی کے لئے ہی وقف نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہر کامیاب فنکار کی آواز اسکا مقام اپنے زمان و مکان تک ہی محدود مقید نہیں رہتا ادوار اسکی ذات میں پناہ لیتے ہیں اسکے لہجے کی بلندی و آہنگی اسکے ترنم کی بازگشت عرصہ دراز تک فضاؤں میں لہراتی رہتی ہے۔

''سبز آنکھیں
بے کراں آنکھیں تیری
کلبۂ نسیان میں
اور برف کے طوفان میں
دھندلی ہوئیں خالی ہوئیں
یہ فنا کے گرم بوسوں کے نشاں
جل گیا مٹی کا رس
رائیگاں سب رائیگاں''۱

یہ لب ولہجہ جو دور تک ہمارے تعاقب میں رہتا ہے۔ وہ کبھی تنہائی مایوسی اور احساس کمتری کی شکل میں ہمارے قدم قدم چلتا ہے اور کبھی روح کی گہرائیوں سے ماورائیت تک پہونچ جاتا ہے مگر جدیدیت کی رنگ آمیز کہکر موضوع و حال میں برقرار رہتی ہے۔

---

۳۷ '' ایک خط'' خلیل الرحمٰن اعظمی ۱ ''پوسٹر'' ساقی فاروقی

''زندگی رات نہیں
صبح ازل ہے یارو
تم بھی تھک جاؤ
تو اس راہ میں دم لے لینا
اور مری ہی طرح دن کا اجالا لیکر
اپنی تصویر کو عریاں کر کے
اس میں رنگین خیالوں کو منور کرنا
اپنے سوئے ہوئے جذبات
میں حدت لا کر
اپنے احساس کے سفر کو
یوں ہی جاری رکھنا'' [۱]

ایسے دور میں جہاں انسانی زندگی ہر لمحہ ایک نئے خطرے کی منتظر ہو جہاں اطراف و جوانب سے خطرات کی یلغار ہو ایسے ماحول میں بھی لذت زندگی کا حیاتیاتی احساس اور خوشگوار زندگی کا تیقن انھیں مایوس و بے کیف نہیں ہونے دیتا کیونکہ وہ سمجھتے ہیں ہم اس رواں دواں دور میں اپنے مسائل کا حل کسی نہ کسی پیرایہ سے تلاش کر ہی لیں گے ان مسئلوں کا تدارک اگر نہ ہوسکا تو اسے جدید کا رنگ دیکر خوش رنگ پیکر میں ڈھالیں گے، اس طرح وہ اپنی زندگی میں دلچسپی اور دلبستگی کا سامان تو فراہم کر ہی لیں گے۔ اسی رنگ میں بلراج کومل بھی اپنا تخلیقی سفر طے کرتے ہیں۔ نمونہ فن محل نگاہ ہے۔

'' صبح دم ادب کی تلاش
کھل اٹھے، چاروں طرف

---

[۱] '' احساس سفر'' امین اشرف جادۂ شب

چلو کہیں
کسی اجالے چہرے میں
پناہ لیں
کہ اپنے جسم کی تمام روشنی اندھیرا ہو گئی''[1]

''کیا سیر عدم
کیا نقش قدم
کیا سمت سری
کیا خیمہ گری
جب پاؤں اٹھے تو رکنا کیا
جب بند کھلے تو ہاتھ اٹھے
ہر منزل اپنی حد میں تھی
ہر گام بیاباں سرحد تھی [2]

بلراج کومل اور امین اشرف کی فطری خوشیوں میں بھی مایوسی کے لطیف سائے نظر آرہے ہیں۔ جو انکی روحانی خوشیوں کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لیتے جارہے ہیں۔ انھیں جذبات کو وزیر آغا نے کچھ اور جدید انداز میں یوں پیش کیا ہے

''بکھرا بکھرا
الجھا الجھا
ٹوٹا ٹوٹا
کھویا کھویا

---

[1] ''پناہ کی رتلاش'' سید امین اشرف [2] '' آئینہ سے ٹپکتا لہو'' مظہر امام بند ہورتا ہوا بازا

ٹیلی ویژن ہر اک، چہرہ
اپنا چہرہ مانگ رہا تھا'' ؎۲

یہی بکھرا بکھرا شخص جب مایوسی اور محرومی کے طوفان میں کھو جاتا ہے تو اسکی سراسیمگی کا عالم کچھ یوں ہوتا ہے۔

'' مہیب طوفان مہیب تر ہے
پہاڑ ریت کی طرح اڑ رہے ہیں
بس اک آواز گونجتی ہے
'' مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!
مگر کہیں بھی امان نہیں ہے''

اسی آواز کو وزیر آغا نے اندھی آواز کا نام دیا ہے'' میں اس اندھی آواز سے بچنے کی خاطر ہزاروں جتن کر چکا ہوں'' ایسی مہیب طوفان میں ایک اور آواز گونجتی ہے ایک سوال اور ابھرتا ہے۔ کہ کیا ہماری جدید شاعری آئندہ زندگی کی جانب رہنمائی کرتی ہے کیا جدید شعراء کے نظریے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کوئی ایسا راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ جو انسان کو ایک ایسی شاہراہ کی جانب لے جائیں جہاں پہونچ کر وہ حرماں نصیبی کو فراموش کر سکے۔ مرے خیال سے ایسا کوئی مقام نہیں کیونکہ انسانی شعور ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ وہ خوشیوں کے ماحول میں بھی شکستہ دلی کے سامان بآسانی مہیا کر سکتا ہے یہ کلفتوں کے سائے جن سے ہم بظاہر فرار چاہتے ہیں ہر محفل میں ہر شئے پر بہت ہی خاموشی سے مسلط و ہو جاتے ہین یا نھیں بہت ہی احتیاط کے ساتھ ہر شخص سلیقہ سے اپنی روح میں محفوظ رکھتا ہے نیز یہ کہ جدید شاعر کسی جامہ فارمولے یا کسی بے حس نظام کی شاعری نہیں اسلئے جذباتی رویوں کا انداز اور بھی واضح ہو جانا جدید ترین شعراء کا معمول ہے' اگر چہ امر واقعہ حیرت انگیز ہے مثالیں بطور ثبوت دیدنی ہیں ملاحظہ کریں۔

"تو راہی انجان مسافر
جنگل کا آغاز نہ آخر
سب رستے تائید میں اس کے
سب راہیں مسدود سراسر" [1]

"امید صبح !
میری رات مس بدلیتی ہوئی
میں ایک مساندہ مسافر
خیال وخواب لئے
تیری تلاش میں نکلا
جواب بھی
جاری ہے" [2]

یہ شوق سفر نئی نئی منزلوں سے آشنا کرتا ہے جہاں فطرت کے حسین منظر بھی ہوتے ہیں۔ اور پراسرار و پرحول سناٹے بھی جو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہوئے اسے زندگی کا مقام دیتے ہیں۔ 'شام اور سایۓ' میں وزیر آغا کی بیشتر نظموں میں اس موضوع کو خوبصورت علامات کے ذریعہ مختلف اندازمس پیش کیا گیا ہے زندگی اور اسکے وجود کے لاتعدعوامل کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں۔

"تیرگی خاموشی بہم ہوکر
شہر کی ٹیڑھی تنگ گلیوں میں
بے خطر بے دھڑک چلی آئیں
گل شدہ آنکنوں کو پا کریں

---

[1] "جنگل" وزیر آغا [2] "تلاش" سید امین اشرف [3] "بلیک آؤٹ" وزیر آغا شام اور سائے

ٹمٹماتے دلوں پہ وار کریں
اور کواڑوں سے اپنا سر پھوڑیں'' ۳۷
'' کھڑکی کی آنکھ بجھی دنیا بدل گئی
دکھ اوٹ سے کواڑ کی میری طرف بڑھا
بھیگی ہوئی نظر سے مجھے گھورنے لگا '' ۱

جدید طرز و طریق کے ابتدائی مراحل جوش و خروش کے سبب کچھ منفی قدریں بھی پیدا کر دیتے ہیں ۔ جس میں جذبات کی ارزانی اور الفاظ کی پیوند کاری کو بھی شاعری کا نام دیا گیا ۔ مگر جوش و خروش کا طوفان جب تھما تو مشینی اور فارمولائی نظریات کے حامی آہستہ آہستہ الگ ہوتے گئے البتہ ذہن جدید اور نظر جدید کے نمائندہ شاعر جدیدیت کی یہ متاع لیکر سامنے آئے اور نئی شاعری کے حوالے سے اردو نظموں کے سرمائے کو وسیع کرنا چاہا ۔ ان کاوشوں میں جدید سے جدید ترین عناصر کی جستجو میں ہمارے شعراء کیا حاصل کر سکے بہ زبان وزیر آغا ۔

'' جدیدیت ایک وسیع اور کشادہ تحریک ہے جس میں
سماجی شعور کے علاوہ روحانی ارتقاء تہذیبی نکھار
اور تخلیقی سطح بھی شامل ہے'' ۳۸

جدیدیت نے جہاں ایک جانب عقل و شعور کی نئی راہیں ہموار کر کے ذہنی بیداری بے باکی اور لہجوں کو سبک روی اور سلیقہ شعاری بخشی وہیں کچھ جذباتی کیفیات کا اظہار بھی جدیدیت کے پس پردہ بڑی شان سے کرتا ہے زاہد ڈار ''لفظوں کے سلسلے میں''

''لیکن جو ٹھیک پوچھو

۱ ''دکھ'' وزیر آغا ۳۸ ایک مضمون وزیر آغا

تو یارو آسماں پر
کوئی خدا نہیں ہے
تیرا خدا جدا ہے

مرا خدا جدا ہے
مرے لئے تو یارو
لڑکی کا خوبصورت
ننگا بدن خدا ہے'' [۱]

ساقی فاروقی اسی طلب کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

''رگوں میں ناچ رہا ہے اک آتشیں زہراب
تری تلاش فقط جسم کا تقاضہ ہے
لہو پکارتا ہے کیا سنا نہیں تو نے
کو میں نے روح کی دیوار ہی گرادی ہے۔ [۲]

ہمارے شعراء نے جنسی قطعات کے آزادنہ افہام وتفہیم اور بے باکانہ اظہار میں میں ان راستوں کی شناخت ہی ختم کردی جس پر اخلاق وموعظمت کی حد بندی تھی۔ اگر چہ انھوں نے اسکا استعمال تخلیقی سطح پر ہی کیا۔ مگر اخلاقی گرفت انھیں کبھی معاف نہ کر سکے گی۔

بالیقین یہ رائے نہیں قائم کی جاسکتی کہ اس نوعیت کی نظمیں شعراء کے نفسیات کی ہی غماز ہیں۔ بلکہ ان کے خیالات میں پورے معاشرے اور اسکے نظام کا عکس اور اسپر طنز بھی

---

[۱] '' لفظوں کے سلسلے'' زاہد ڈار [۲] ساقی فاروقی

ہیں دورِ جدیدہ کی اخلاقی تہذیبی اور اقدار کی پستی ایک حساس ذہن کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اسکے اظہار کے ذریعہ معاشرے کی بداعمالیوں کی طرف اشارہ کرے۔ چونکہ جدید قاری بھی تلمیح تشبیہ یا اخلاقی علامات واستعارے کے بھنور میں غوطے نہیں کھانا چاہتا وہ اختصار و تناظر کو پسند کرتا ہے۔ پھر بھی ایک شاعر اپنے جذبات یا احساسات کے اظہار ان الفاظ سے تو گریز کر ہی سکتا ہے۔ جو سماعت ک لئے بارگران ہو جائیں۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ محض جنس ہی انسانی وجود کی میراث ہے اور دوسرے جذبات بھی ہیں جنکا جنسیت سے رشتہ جوڑ دینا انسانیت کی حق تلفی ہوگی۔

''دن نہ محتاج سورج کی کرنوں کا ہو
نہ رات ہو چاند کی منتظر
مجھ کو تم سے
نہ تم کو
مری ذات سے
کوئی امید
کوئی طلب نہ رہے
اسطرح
ہم جینے کا وعدہ کریں
آؤ عہد وفا کو نیا رنگ دیں
اور آہنگ دیں
زندگی کو نیا ''[۱]

---

[۱] ''نیا آہنگ''، تسنیم فاطمہ

آج ہمارے شعراء کو ایسے ہی جذبے کہ تلاش ہے جو بے غرضانہ ار بےلوث ہو اور ہامرے معاشرے کو ایسے ہی انسان کی تلاش ہے جو معصوم اور مخلص ہو ان کی نظموں کا انسان محبت اور رفاقت کا بھوکا ہے تضع اور ریا کاری سے نفرت کرتا ہے اکیسویں صدی میں جدیدیت کا مظہر ایسا نظام ہوگا جس میں نہ طبقات وتفرقات کی زنجیریں ہونگی نہ ظلم واستبداد کے سائے ۔آج ایسے انسان کی ظہور ہے۔ جو نہ آقا ہے نہ غلام بلکہ صرف انسان ہے۔ بقول سردار جعفری۔

''آج پہلی بار اس محنت کش کا ظہور ہو رہا ہے
جو جسمانی اور ذہنی محبت خانوں میں تقسیم نہیں ہے
اور جو اپنی محبت کی قدر و قیمت جانتا ہے۔آج پہلی بار
وہ انسان زمین پر قدم رکھ رہا ہے جو فطرت سے خوف
زدہ نہیں ہے۔اور جو قوانین فطرت کا علم حاصل کر کے
فطرت کی قوتوں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار رہا ہے۔آج
پہلی بار وہ انسان پیدا ہورہا ہے جو رنگ و نسل کے
امتیازات اور جغرافیائی حدود میں اسیر نہیں'' ۳۹

اولاد آدم نے اس خواب کو قرنوں پہلے دیکھا گذشتہ صدیوں نے اسکی بشارت دی ۔اور ماضی نے اسکے گیت گائے اپنے مقصد کے لئے جنگ جاری تھی' وہ عظیم الشان ہونے کے ساتھ ساتھ حوصلہ شکست بھی تھی ۔اب بھی کچھ ایسے عناصر اس انسان کی روحانی قوت کو سلب کرنے میں مصروف ہیں وہ جو طیاروں' راکٹوں' توپوں اور بندوقوں اور دیگر تباہ کن فارمولوں سے اس دنیا کو ہی فنا کر دینا چاہتے ہیں جہاں انسانیت کو عروج ملنے والا ہے ان شیطانی حربوں

---

۳۹ ایک مضمون علی سردار جعفری

کے مقابلہ میں وہ قوتیں آرہی ہیں جس میں ساز، سنگیت، شاعری، علم وحکمت اور ہنر کے ناقابل شکست ہتھیار ہیں۔

''اور وہ شعلہ نفس شاعر و افسانہ نگار
اپنے نغموں کی حرارت سے گلا دیتے ہیں
روح کے بوجھ کو افکار کی زنجیروں کو
ان کا ہر شعر رجز پڑھتا ہے۔
ہر سطر کہتی ہے جرأت کی کہانی ہم سے ''

سردار جعفری کا خیال ہے کہ اگر شاعری میں بلند آہنگی اور پر جوش انداز بیان ہے تو وہ جوش اور ولولہ مظلوموں مجبوروں کو بھی عطا کر سکتا ہے شاعر کی شعلہ نوائی عوام کو روحانی اضطراب اور تفکرات سے رہائی دے سکتی ہے کیوں کہ ان کی شعلہ فشانی کا ایک ایک لفظ ہمت واستقلال کی تلقین کرتا ہے۔

'' حضور کی جنبش نظر کے
تمام جلاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاری کریں
تو تعمیل بندگی ہو
کہاں یہ سر اور کہاں یہ دستار اتارنا احسن العمل ہے
کہاں یہ ہاتھوں کہاں زبانوں کو قطع کیجئے
کہاں یہ دروازہ رزق کا بند کرنا ہوگا
کہاں پہ آسائشوں کی، بھوکوں کو مار دیجئے
کہاں بٹے گی لعان کی چھوٹ

---

[۱] ''فروغ فرخ زاد کے لئے'' پروین شاکر خود کلامی

اور کہاں پر
رجیم کے احکام جاری ہونگے'' [1]

یہ امر قابل تحقیق اور محل بیان ہے کہ شاعری کیا ہے' اس کے فنی لوزم کیا ہیں، اسکی بوطیاتی کی جزمیات کیا کیا ہیں کیا یہ عطائی عمل ہے یا کسبی؟ بعضوں نے تخلیقی عمل کو دونوں کا امتزاج قرار دیا ہے یعنی فن کیلیئے محنت ساقہ کے ساتھ خلوص و جذبہ کی کارفرمائی بھی ضروری ہے، اسی محنت ساقہ کی ایک مثال سرمایہ داری اور مادی ترقیوں کا عروج ہے۔

زمانہ لاکھ مادی ترقیوں پر فتح حاصل کرلے' معاشرے کی بے انصافیوں اور ناہمواریوں کے خلاف فتح یاب ہونا آسان نہیں' اسکا مقدر جنگ ہے۔ یہی جنگ اسکی زندگی میں طبقائی کشمکش کیلیئے راہ ہموار کرتی ہے۔ ہمارے جدید ترین شعراء بھی اس جنگ میں شریک رہے ہیں۔

''اور جب سارے موسم
سب رتیں برابر تقسیم کردی گئیں
اور کہا گیا کہ ہم سب کے پاس
ہر شئے یکساں ہے تو پھر مٹھیاں کھولنے
اور جیبیں ٹٹولنے کی جنگ
کیوں شروع ہوگئی؟''

''مختلف ہیں آئینوں کے زاویے
ایک لیکن عکس ذات
اک اکائی پر اسی کی ضرب سے
کثرت وحدت کا پیدا ہے طلسم
خلوت آئینہ خانہ میں کہیں کوئی نہیں
صرف میں ہی بت

اور میں ہی بت پرست
میں ہی بزم ذات میں رونق فروز''

سائنس کی تکنیکی ترقیوں ایجادوں سے فضائیں پر آلودہ ہوئیں اور مستحکم عناصر بھی دھندلانے لگے تو شعراء کے اعتقاد بھی متزلزل ہو گئے ان کے پاس پھر کوئی ایسا عقدیدہ نہ رہا جسے وہ کسی خاص مقصد کے تحت بروئے کار لاتے انھیں کسی جماعت یا مشن سے دلچسپی نہ رہی اسی سبب انھوں نے مذہب اخلاق اور فلسفہ جیسی قدروں سے آزادی حاصل کر لی اور اپنے پیش روؤں کی طرح کائنات حیات اور ممات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے بجائے اپنی ذات کو سمجھنے میں محو ہو گیا۔ جب اس نے شاعری کے زریعہ مذہبی تبلیغ اخلاق تلقین اور معاشرتی اصلاح کی جانب سے رخ پھیرا تو اسکے نظریہ و تجربات خود اپنی ذات تک محدود ہو گئے۔

'' میں برائی کا پیغمبر بے اماں
تری بستی پہ پھر ٹوٹ کر چھا گیا
میرے فتراک میں
کذب کی چاندنی
افترا کا سجایا ہوا گلستاں
قلب انسان کا وہ گناہ کہن
جو زمانوں کے صحرائے بے آب میں
ایک قدر تسلسل کا غماز ہے
میں اندھیرے کا آتش بلب جام ہوں
ایک ترغیب ہوں
ایک ترغیب ہوں
میرے نزدیک کوئی بھی اپنا پرایا نہیں

---

[1] ''اہرمن'' سید امین اشرف

میرے آگے کوئی دیپ جلتا نہیں'' ؎

'میں اندھیرے کا آتش بلب جام ہوں' یہ Gnomic بیان جس میں' اہرمن کے' سارے مضمرات کو چند علامات کے بطن میں اسیر کرلیا گیا ہے یہ انداز بیان شاعر کی قوت گویائی پر شہادت ہے اپنی ذات کا محاسبہ کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہی انسان جو شرف اعلیٰ ہے وہ کبھی کبھی شر و افترا کا پیکر بن جاتا ہے نہ اسے رشتوں رابطوں کا خیال رہتا ہے اور نہ ہی کسی مقدس جذبہ کا احساس فنکار نے اس نظم میں خود کو برائی کا ایسا پیامبر بتایا ہے جو ہر قید و بند سے آزاد ہے اسکا خیال ہے کہ انسان کا دل برائیوں کی آماجگاہ بن جائے تو وہ سارے اصول وضوابط کا فراموش کردیتا ہے۔

اس نظم میں عرفان ذات کے ذریعے خودشناسی اور خودکلامی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اپنے خیالات کے جہاد میں انھیں یہ احساس ہی نہ رہا کہ عوام اسکے کلام سے کس درجہ متاثر ہوئے ہونگے۔ اسے مستحسن قرار دیا جائے گا یا مردودالزام ٹھہرایا جائیگا۔ معاشعرے کے فریب کاریوں میں اور سیاسی بداعمالیوں نے اسے برگشتہ کررکھا تھا۔ اسی برگشتہ طبعی نے اسے سیاسی اور معاشرتی اصول وقوانین کے فارمولوں کی یکسر تردید کردی اور یوں مخاطب ہوا۔

''میں اجنبی میں بے نشاں
میں پابہ گل
نہ رفعت مقام ہے
نہ شہرت دوام ہے
یہ لوح دل۔ یہ لوح دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے'' ؎

؎ '' آٹوگراف'' مجید امجد

''مجھکو ہے اب تک تلاش
زندگی کے تازہ جولاں گاہ کی

اور بےزاری سی ہے
زندگی کے کہنہ آہنگ مسلسل سے مجھے
سرزمین زیست کی افسردہ محفل سے مجھے''[۱]

دراصل جدید شاعری آج کے معاشرتی مسائل کو اپنی ذات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ہی ذات پر تجربات کے ذریعہ انکو حل کرنے کی سعی کرتا ہے نئے تجربات اور نئے احساسات میں عصری اقتضا اور فرد کے ساتھ ظالمانہ رویہ نظر آتا ہے۔ جسے شاعر اپنی ذات کے پس پردہ بلند و بالا آواز میں بلا تامل پیش کر دیتا ہے کیونکہ وہ اپنی ذات سے وابستہ فکری عناصر کے بیان میں پوری طور سے آزاد ہوتا ہے۔

میں اپنے سوالوں کے زنجیر میں قید ہوں اور افکار کے رات
دن سے گزر رہا ہوں مرے لئے معجزے اور پرانی کتابوں
میں لکھی ہوئی سچائیاں مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پر ٹنگی
ہوئی تختیاں ہیں'' [۲]

''میرے افکار
زنجیروں میں جکڑے ہیں
سیاست پہرہ دیتی ہے

---

[۱] ''وادیٔ پنہاں'' ن م راشد [۲] ''ایک کتبہ'' سلیم الرحمٰن

مرے احساس وجذبہ کے
درودیوار پر ہردم
جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں سکتا
جو کہنا چاہتا ہوں کہہ نہیں سکتا
میں جینا چاہتا ہوں اتنا
زندہ رہ نہیں سکتا
حقائق گھٹ کے رہ جاتے ہیں
سچائی فنا کے گھاٹ اترتی ہے
یہی بس اپنی ہستی ہے
مجھے احساس ہے اسکا
میں اپنے آپ میں آدھا ادھورا ہوں'' [۱]

جدید شاعری میں عرفان ذات تک رسائی احساس تنہائی اور تنگ نظری سے بیزاری کا سبب فلسفہ وجودیت بھی ہوسکتا ہے۔ یہ فلسفہ دراصل ایک ایسے تلخ تجزیہ کو راہ دیتا ہے جہاں مادی اشیاء کوئی حقیقت نہیں رکھتیں وجودیت کے سامنے وہ بے معنی نظر آتی ہیں۔ اسی فلسفہ کے زیر اثر انسانی مسائل پر جدید فلسفہ سے غور کرنے کی تحریک چلائی گئی۔ جس کے عمل میں آتے ہی زندگی کی حقیقت کم سے کم تر ہوتی گئی۔ اس ضمن میں شمیم حنفی کے خیالات قابل بیان ہیں:-

نئی شاعری انسانی اعمال کو اس لئے بالمعوم کوئی اخلاقی حکم لگانے سے گریز کرتی ہے۔ اور انسانی وجود کی ان تاریکیوں کو بھی تخلیقی تجربہ بتاتی ہے جن کے غبار میں نیکیاں گم ہوجاتی

---

[۱] ''آدھا ادھورا'' ص۳۴ ''نئی شعری روایت'' شمیم حنفی

ہیں'' ۴۰؎

''میں نے زہد ہ تقویٰ کا ملبوس اتار دیا ہے
اور پراگندہ مٹی میں دفن گنہہ سے صد سالوں۔
پوشیدہ تن کو
میلا کر کے عریاں کر ڈالا ہے۔''

''جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لئے پھرتا ہوں
ان کو کہنے کا مجھ کو یارا نہیں ہے
میں دوسروں کی لکھی کتابوں میں
داستان اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگزشت مری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں'' ۱؎

یہ نظم معاشرتی نظام کی لفظ بہ لفظ غماز ہے انسان کے اقوال و افکار میں کتنا تغیر آ گیا ہے۔ وہ اپنے وجود کو کس طرح پراگندہ کر رہا ہے۔ خود بینی اور تنہائی کی حسیت بھی وجودیت کے تاثر سے سامنے آئی اور جدید شاعری کا ایک اہم جزو بن گئی جس نے صرف اپنی ذات کو اہم سمجھا اور اسے کائنات کا ایک محور تسلیم کیا نتیجہ یہ نکلا کہ صحراؤں میں بھٹکتے ہوئے بھی محرومی اور شکستگی کے احساس زیاں نے اسے وہ طاقت عطا کی جسکے رہیں منت اسنے زندگی کے تمام معرکے سر کر لئے۔ منصور اعجاز کی یہ تخلیقی ساخت مذکور کردہ امر کی بین دلیل ہے۔

۱؎ '' ذاتیات''، خلیل الرحمن اعظمی

''اک تمنا اتنی ترسی

جتنا نرگس دید کو

اک گھاؤ اتنا گہرا

جتنا صحرا میں چھپا

ایک گم شدہ تاریک غار

ایک بوسہ اتنا تشنہ

سوختہ صدیوں کی ریت

ایک وعدہ پھر سے ملنے کا مگر

حشر تک انتظار

ایک دل اور اتنا سچا

جیسے روح کی کائنات

یہ تمنا کا ترسنا

زخم کی گہرائیاں

زندگی کی تشنگی اور محشر کا خیال

ساری چیزیں گھل گئیں حل ہو گئیں

تب کہیں جا کر بنا میرا وجود

ابن آدم فخر کر

یہ تیرے رب کی رحمتیں ہیں'' [۱]

منصور اعجاز کی یہ تخلیق اس وجود کی پیکر گری ہے جو ازل تا ابد زندگی کے مراحل سے گزرتا ہوا اپنے رب کی رحمتوں کا شکر گزار ہے اور اپنی تخلیق پر فخر کرتا ہے۔ اگر انسان اسی

---

[۱] ''ایک نظم'' منصور اعجاز

خیال سے اتفاق کرے تو ساری دشواریٔ حیات اسی ماحول میں اسے خوشگواریاں عطا کرسکتی ہیں۔اس طرح سید امین اشرف کی نظم 'مستقبل' بھی انسان کو زندگی کی کشمکش سے گزر جانے کی ترغیب یوں دیتی ہے۔

"گرد راہ تمنا کو محمل نہ کہو
راہ دشوار منزل کو منزل نہ کہو
حسرتوں کے انبار کو دل نہ کہو
دشت راہوں میں بکھرا ہوا وقت ہے
یہ گزر جائیگا
یہ گزر جائیگا" ۱

یہ نظم بھی عرفان ذات کے آئینے میں ایک مجرد تصور کے احساسات کو بڑی خوبی اور بلاغت سے پیش کرتی ہے انکی نظم 'لالہ صحرائی' میں بھی کم وبیش یہی انداز اپنایا گیا ہے۔ لیکن یہ ادل الذکر نظموں کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

---

۱ "ترغیب" امین اشرف

عرفان ذات کی طرف مراجعت کی دوسری شکل نفسیاتی علم ہے لاشعور میں اتر کر اپنی ذات کی دریافت کا عمل جدید شعراء کا رجحان رہا ہے یہ دریافت صرف جنس کی عملداری تک محدود نہیں ۔ بلکہ روزمرہ پیش آنے والے ذاتی تجربات بھی اسی نئی دریافت کے دائرے میں آتے ہیں البتہ نفس پروری کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ وہ جنسی مسائل کے معنی میں ہو یا اخلاقی یا تہذیبی دائرے میں ۔

''نفس کی آمد وشداب بھی جاری ہے
اگرچہ وقت کی رفتار بھاری ہے
ابھی کھڑکی سے چھن کر تیز دھوپ کی کرنیں
سر دیوار تصویر بناتی ہیں
ابھی پھولوں کی خوشبوئیں
ہوا کے ساتھ آتی ہیں
ابھی اڑتی ہوئی چڑیاں
سویرے ہی سویرے آ جگاتی ہیں
ابھی میرے لئے تیرے نگاہوں میں
وہی پہلی محبت ہے
جوانی جا چکی ہے لیکن
بڑھاپا ایک نعمت ہے'' [۱]

---

[۱] ''بڑھاپا آ چکا تھا'' منیب الرحمٰن

''مت پوچھ کی دنیا میں ہوا کیا
میں اڑتا ہوا رنگ ہوں
شعلے کے ذخیرے، سے ملا کیا
تو ٹھہری ہوئی لہر ہے
ہنستے ہوئے ساحل سے گلہ کیا''[۱]

تحلیل نفسی کے ذریعہ اپنی ذات کی دریافت کی سب سے نمایاں کوشش پروین شاکر فہمیدہ ریاض، احمد ہمیش، محمد علوی، بلراج کومل، بمل کرشن اشک وغیرہ نے کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو جنسی موضوعات کی ہی آماجگاہ نہیں بنائی۔ بلکہ شعوری جبلّیت پر بھی تجربات کرتے رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ شعراء نے جنسی موضوعات کی اہمیت کو بالا رکھا۔ ان کا اہم مسئلہ جنس کی قید سے رہائی تھا۔ اس کشمکش میں جن نفسیاتی حقائق کا انھیں سامنا کرنا پڑا آسان نہ تھا پھر بھی نیا شاعر اس چیلنج کو قبول کرتا ہے اور مجبوراً کسی سماجی یا اخلاقی ضابطے کی پابندی کے بغیر اپنی نفسیاتی سچائیوں کا اظہار کرتا ہے۔ فہمیدہ ریاض کا آرٹ' کرافٹنگ کی اس سچائی کی تصدیق کرتا ہے۔ شاعرہ کے نرم و نازک الفاظ دیدنی ہیں اور ان کی معنیات قابل ستائش ہے ملاحظہ کریں۔

''بھیگ رہا تھا سارا عالم
ایسی تھی بوچھار
پورا میگھ ملہار
پور پور میں گونج رہا تھا راگ
تو پھر اپنے پل میں

''دلاسہ'' ساقی فاروقی رادار

آپ نے کہاں سنا ہوگا
میں خود سن کر حیراں تھی
اتنے کومل سر میں جھنکتا
ایک اکیلا تار'' ۱؎

''سایہ بن کر خیال چھاتا ہے
شام کے انتظار میں روشن
اک چراغ اس میں جگمگاتا ہے
آپ مڑ کر جو دیکھتے بھی نہیں
رات کو روز ٹوٹ جاتا ہے'' ۲؎

جدیدیت کی یہ کوشش رہی کہ جنس کے برملا اظہار سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ ہاں عشقیہ احساس کو اس دور میں بھی فوقیت حاصل رہی اس ضمن میں منیب الرحمٰن کی عشقیہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ لیکن عشقیہ موضوع پر ان کی گرفت نفسیاتی نہیں ہے۔ بلکہ رومانی احساس اور رجحان ملتا ہے۔

''میں اسے دیکھتا تھا کھڑکی سے
سر اٹھائے ہوئے بصد انداز
دوش پر زندگی کا بار لئے
دل کے اندر چھپائے وقت کے راز
اس سے وابستہ ہیں مری یادیں
دن ہمارے کٹے تھے قربت میں

۱؎ ''ان سنی'' ۲؎ ''شگفتہ'' فہمیدہ ریاض ۳؎ ''جڑیں'' منیب الرحمٰن

مجھ کو ملتا تھا دل کا صبر و سکوں

اس کی خاطر نواز صحبت میں'' [۳]

''میں گھر میں تھا اکیلا

کیسی وہ بے دلی تھی

بکھری ہوئی تھیں چیزیں

ہر سمت ابتری تھی

جوتے ادھر پڑے تھے

ٹوپی ادھر پڑی تھی

آنکھوں سے جیسے آنسو

برسات کی جھڑی تھی

دل بھی ترس رہا تھا

جس دن سے تم گئی تھیں

پانی برس رہا تھا'' [۱]

جدید شعراء نے علم نفس کے زریعہ جذباتی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کا نفسیاتی علاج تلاش کرلیا ہے۔ بہت سے ایسے امراض جو جذباتی کنٹرول سے پیدا ہوتے ہیں اسکا علاج صرف جذبات کے اظہار اور تسکین ہی ہوسکتا ہے۔ کچھ شعراء نے اس مسئلہ کے حل اور اسکے اظہار کو شاعری کا ذریعہ بنایا۔لیکن تہذیبی اور اخلاقی اقدار کو قائم رکھا۔

''وہ کہتی ہے

تم گہری نظروں سے

---

[۱] ''پانی برس رہا تھا'' منیب الرحمٰن''

جب مجھ کو تکتے ہو
بے چینی کا ہوتا ہے احساس مجھے
میں حیراں ہوں میری نظریں
کیسے اسکی بے چینی کا سبب بنی ہیں
کیوں کہ جب اسکا سرخ چمکتا چہرہ
تکتا ہوں تو میرے اندر
نور بھری خوشبو کا نغمہ لہراتا ہے'' [۱]

جدیدیت کا عبوری دور جو ۷۰ء سے ۸۰ء تک تسلیم کیا گیا اس دور کو تحلیل نفسی کے مخصوص موضوع سے وابستہ کیا جا سکتا ہے نفسیاتی اظہار بیان کے اس دور میں شعراء نے آزادیٔ خیال کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ آزاد معاشرے میں کچھ شعراء نے ایسی سچائی کا پردہ فاش کیا جسے کوئی بھی مہذب قاری برداشت نہیں کرسکتا۔ بعض ناقدین نے انھیں سچائیوں کو عریاں نگاری کا نام دیا نمونہ نذر قارئین ہے۔

''ہاں یہ موسم تو وہ ہے
کہ جس میں نظر چپ رہے
اور بدن بات کرتا رہے۔
اس کے ہاتھوں کو شبنم بنالوں میں
چہرہ مرا
پھول کی طرح ہلکورے لیتا رہے
پنکھڑی پنکھڑی
اس کے بوسوں کی بارش میں
پیہم نکھرتی رہے

---

[۱] ''نور بھری خشبو کا نغمہ'' اشہر ہاشمی [۲] ایک نظم

زندگی اس جنوں خیز بارش کے شانوں پر سر کو رکھے
رقص کرتی رہے۔''[۲]

یہ نفسیاتی اور جذباتی جوش و جنوں رفتہ رفتہ تھمتا گیا' ۸۰ء سے ۹۰ء کے درمیان غور فکر کی راہیں ہموار ہوتی گئیں اور دور حاضر کی شاعری سیاسی معاشرتی روزمرہ کے اہم اور غیر اہم مسائل کی آئینہ دار ہے نیا شاعر کبھی انسانی رشتوں پر قائم زندگی اور زندگی کی مصروفیت کے درمیان مقابلہ اور موازنہ کرتا ہے اور کبھی جدیدیت سے متاثر ہو کر نئے رشتوں کا متلاشی رہتا ہے یہی تلاش اور جستجو یعنی خود اپنی ذات کی تلاش ہی نئی شاعری کا رجحان رہا ہے۔ انھیں رجحانات کے تحت آج شاعر امتیازی حیثیت کے ساتھ ابھر رہا ہے۔

''جان جاں
قرب کی لذت سے ہوں میں آشنا
شب کے سناٹے میں زلفوں کی گھٹا
گفتگو پیہم لب رخسار کی
لمس کا دیوانہ پن
وصل کی جادوگری' دارفتگی
ایسی کیفیت کہ اپنے آپ پر آجائے رشک''[۱]

''کہیں اپنی روح کو دور
اور غیر محفوظ نہیں چھوڑا جاتا
جسم سے جسم کا رشتہ
تو آخر تک نبھتا ہے
ٹوٹ ہی جاتا ہے
لیکن روح کا روح سے رشتہ
لاکھ کوشش کرنے پر بھی

---

[۱] ''تکمیل'' رفعت سروش [۲] ''روح کا رشتہ'' فضل امام رضوی

کبھی نہیں ٹوٹتا
کبھی نہیں ٹوٹتا'' [۲]

'' آتے سب آنے والے
کچھ اجنبی کچھ رفیق و ہمدم
لیکن کئی سال مجھ پہ گزرے
سننے کے لئے ترس گیا ہوں
دستک کہ جواب بھی جانتی ہے
وہ نام جو مرے پیار کا ہے'' [۱]

''میں ہر بار بالوں میں کنگھی ادھوری ہی کر پا رہی ہوں
تمہاری محبت بھری انگلیاں روک لیتی ہیں مجھ کو
میں اب مانتی جا رہی ہوں
میرے اندر کی ساری رتیں
اور باہر کے موسم
تمہارے سبب تھے
تمہارے لئے تھے'' [۲]

''بس اب تو جینے کا ایک ہی سلسلہ ہے جاناں
تمہاری سوچوں میں ڈوبے رہنا
تمہارے خوابوں میں کھوئے رہنا
کسی طرح تم کو دیکھنے کی سبیل کرنا'' [۳]

---

[۱] ''رفتگاں''، خلیل الرحمٰن اعظمی [۲] ''ایک خط'' [۳] ''خود کلامی'' پروین شاکر

''اور پھر رنگ ملاقات کا گہرا ہونا
اور پھر ملنے کی خواہش کا سمندر ہونا
دھیرے دھیرے
کسی تصویر کے ٹکڑے ملنا
جسکی ترتیب نے دوروحوں کا سمبندھ کیا
اور یہ سچ ہے
کہ حیرت کدۂ ہستی میں
ایک پہچان کا لمحہ بھی بہت ہوتا ہے''[۱]

بلاشبہ اس انفس و آفاق میں شناخت کا ایک لمحہ بھی کافی ہے۔
''کتنے زمانے بھی ہیں جنکا نہیں کوئی نام''

شناخت پہچان اور انفرادیت میں انفرادیت کا جز اگر علیحدہ بھی کر دیا جائے تو پہچان ہی کافی بڑی نعمت کی حامل قرار پائے گی دولوگوں، دوچیزوں یا دودلوں کے درمیان پہچان کا رشتہ شائد اس کائنات کی اہم ترین ضرورت ہے جس کی ارزانی میں انسانیت بے قرار نظر آتی ہے۔

''خوف کا سانپ،
رگ رگ میں خوں کی سرسراتا رہا:
رات کے چند بے کار لمحات کی راز داں
دیکھ پائے نہ بھرے سمندر کی آوارہ کا چہرہ

---

۱ ''خود کلامی'' پروین شاکر ۲ ''آنگن میں ایک شام'' مظہر امام

اور پوچھے محبت سے اصرار سے:
یہ بیٹے بٹھائے تمہیں کیا ہوا ہے
کچھ مجھے بھی کہو۔ !''

''وہ تیرے الطاف بے پایاں کی رات
وہ تیرا اخلاق بے پروا خلوص بے نیاز
مری جانب سے کوئی تحفہ نہیں
زیور نہیں
ساری نہیں
اجرت نہیں
حد تو یہ ہے کہ شادی کا وعدہ بھی نہیں''

یہ وعدۂ شادی دراصل خوشیوں کا زیور کا پیغام ہے۔ مگر زندگی خالی، خالی تنہا، تنہا تمام کائنات میں اندھیرا شاید آج کے نوع انساں کا یہی مقدر ہے نہ تحفہ حیات اور نہ ہی تزئین کائنات، کیا زندگی بے معنی ہے۔ شاعر کی بے قراری گہری سوچ اور گہرے مطالعہ کے باعث ہے اور خالص تجربہ پر مبنی ہے۔

دور جدید سے قبل اردو شاعری میں داخلی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ صرف غزل تھی۔نظم خارجی دنیا سے متعلق نظر آتی تھی نتیجتاً حرماں نصیبی وافسردہ دلی اورغم والم کی تمام کیفیات زیادہ ترغزل کے اشعار میں ابھرتے نظر آتے ہیں اس کے برعکس نظم نے قلبی واردات سے بے نیازی کو اپنا شیوہ بنا رکھا تھا گذشتہ دور کی بیشتر قومی اور انقلابی نظموں میں بھی ذہنی کرشمہ سازیاں ہی جلوہ گر ہوئی ہیں۔نظیراکبرآبادی، حالی، اور اقبال نے اجتماعی تحریکات کی عکاسی یا اپنی عظمت رفتہ کا احساس دلانے کے لئے ہی نظموں کی تخلیق کی۔دوسرے الفاظ میں ان شعراء کا روئے سخن زیادہ تر خارجی کیفیات اورقومی مسائل کی جانب ہے۔اسی وجہ سے وہ اپنی داخلی واردات کوخارجی دنیا سے ہم آہنگ کر کے پیش کرتے تھے۔

”سکوت شام میں محوسکوت ہے
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھکو
جہاں تمام سواد حرم ہوا مجھ کو“

خارجی دنیا کے مسائل کوشاعری کا موضوع بنانے کا یہ رجحان دور جدید میں رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا ہے اور باطنی دنیا سے ربطہ وضبط کا سلسلہ جدید نظم میں مبوط طریقے سے بڑھتا جارہا ہے۔جدید ترین نظم میں ایک طویل تعمیری رجحان کا ردعمل کچھ اس طرح نمودار ہوا ہے کہ ہمارے بیشتر شعراء داخلیت کی طرف مائل ہوگئے ہیں ان کی نظموں میں دردغم کسک اور افسردہ دلی کی وہ کیفیات نمایاں ہوئی ہیں جو دروں بینی کے عمل کی رہین منت ہیں جدید نظم میں

داخلیت کے تمام محاسن کی نمایاں مثالیں قیوم نظر کی شاعری میں ملتی ہیں قیوم نظر نے اپنی نظموں کے مجموعے 'قندیل' کے دیباچہ میں شعراء کی دروں بینی پر یوں اظہار خیال کیا ہے:-

'' درحقیقت ہر نئے شاعر نے اپنی ایک دنیا الگ بسائی
ہے جس میں اسکے اپنے ہی خیالات اعتقاد محسوسات
اور پھر ان میں ہر ایک کے اظہار کے عجیب وغریب
استعاروں اور تشبیہوں کے جال بچھے ہیں وہ اپنی اس دنیا
میں مگن او دوسرے کی دنیا سے بے نیاز ہے '' [۴۱]

ان خیالات سے قیوم نظر کے اس نقطہ نظر کا سراغ ملتا ہے جس کے تحت انھوں نے خارجی موضوعات کی بہ نسبت داخلی واقعات کو زیادہ اہمیت دی ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

''زندگی رنگ وبو سے بے گانہ
سرنگوں دل گرفتہ اور اداس
آہ وہ اس کے قہقہے اور میں
دل ناکام کی تن آسانی
خندہ زن ہے مرے ارادوں پر
ورنہ دریائے غم بہے اور میں ؟ '' [۱]

مظہر امام کا پہلا مجموعہ کلام 'زخم تمنا' جسکی بیشتر نظمیں داخلی کیفیات کی غماز اور شدید داخلی احساسات کا پیکر ہیں یہ نظمیں شاعر کے داخلی جذباتی مزاج کی ترجمانی ہی نہیں کرتی بلکہ ان کیفیات کو بے حد ہم آہنگی اور سلیقے سے پیش کرتی ہیں ۔ یہ نہیں بلکہ یاس ومحرومی کی لہروں

---

[۴۱] ''دیباچہ قندیل'' قیوم نظر

سے ایک ایسی نغمگی کا احساس ہوتا ہے جس سے جسم و روح کے مطالبات کا ازالہ ہوتا ہے۔

''آؤ
کچھ دیر یہاں بیٹھیں
کوئی بات کریں
جنگ کا ذکر سہی
باغ کے ہنستے ہوئے پھولوں کی تعریف سہی
رقص اور سنگ تراشی کی مسائل پہ کوئی بحث سہی
یہ ضروری تو نہیں ہے کہ محبت ہی کریں'' [۱]

مظہر امام کی شاعری پر یاس و محرومی کی ابر آلودہ فضا کا ہی غلبہ نہیں رہا انھوں نے بھی کبھی بہاروں سے آشنائی اور چمن زاروں کی بادہ نمائی کی تھی جس کا اعتراف انھوں نے اسطرح کیا ہے۔

''اپنے کلکتے کے قیام ک زمانے میں.................
میری جذباتی زندگی نامحسوس، غیر مرئی بہاروں سے
آشنا ہوئی میرے بعض خوابوں نے حقیقت کا پیراہن
پہنا اور وہ امنگیں جو اب تک قلب کے زنداں میں
محسوس تھیں کھلی فضا میں سانس لینے لگیں یہی وہ زمانہ
ہے جب میری شاعری میں حوصلوں اور دلوں کی صبح
جگمگاتی اور میرے فکر و شعور سے رجاونشاطی شعاعیں پھوٹیں'' ۴۲

مظہر امام بھی جدید ترین نظریہ کے حامی ہیں۔انھوں نے خارجی حقائق اور

---

۱ ''ٹھہرے ہوئے لمحے سے پرے'' مظہر امام بند ہوتا ہوا بازار ۴۲ اعتراف

معاشرتی مسائل کا ایک جدید انداز سے پیش کرنے میں داخلیت کو مدنظر رکھا ہے ان کی بیشتر نظمیں اس خیال کی عکاس ہیں کہ شاعر اپنے ماحول اور واردات سے قلبی احساس اور جذباتی طور سے وابستہ ہے وہ اپنی حساس مزاج اور نازک طبع سے وقت کی ناسازگاری کو محسوس کر لیتا ہے اپنی زندگی کے حادثات کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ پھر بھی داخلیت کی دسترس سے اسکے کلام میں حزن و یاس کے نقوش نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

'' خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں
ایک غم کے سوا
چہرہ اترا ہوا
بال بکھرے ہوئے
نیند اچٹی ہوئی،
خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں ! ''[1]

دراصل زندگی خود خیر و شر اور تعمیر و تخریب کے انضمام اور تصادم سے عبادت ہے اور زندگی کی مجموعی روانی کے لئے ان دونوں قوتوں کا امتزاج از حد ضروری ہے لیکن زندگی کی بے بسی اور حرماں نصیبی پر شاعر اس وقت افسردہ دلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب اسے کہیں بھی اماں نہیں ملتی قمر امام کی مذکورہ نظمیں شرافت نفس اور اخلاق کردار کی بلندی کی بین مثالیں ہیں جو داخلیت کی بین مثالیں ہیں۔

---

[1] ''اشتراک'' مظہر امام

''کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے
نہ روشنی میں نہ تیرگی میں
نہ زندگی میں نہ خودکشی میں

....

پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے
نہ فرد کا سائباں سلامت
نہ انجمن کا مکاں سلامت
کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟'' [۱]

''حیات کا قافلہ بھٹک کر یہ کیسی منزل پہ آ گیا ہے
نہ کوئی مونس نہ کوئی ہمدم
بس اک لا انتہا خموشی
جو تیرگی کی مہیب، پلکوں پہ منجمد ہو کے رہ گی ہے
شکستہ پا خستہ حال راہی
اداس گم سم
بس اپنی ہی سانس گن رہا ہے'' [۲]

دراصل جدیدیت کے حامیوں میں بیشتر شعراء کو ناسازگاریٔ حالات کا احساس ہے مگر اسکا سامنا کرنے کے لئے وہ اپنی ذات کو آئینہ بناتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے خارجی دنیا کی طرف ان کی پیش روی جذباتی حد تک ہوتی ہے ذہنی یا نظریاتی نہیں وہ اپنے طرز

---

[۱] ''اکھڑتے خیموں کا درد'' مظہر امام [۲] شعاع فردا کے رازدانوں مظہر امام

اظہار کی وجہ سے نہیں پہچانے جاتے' طرز فکر کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے پس پشت ذہنی یا قلبی کیفیت ضرور کارفرما ہوئی ہے وہ صرف الفاظ کی حرف بیانی اور احساس کی ترجمانی کو مختلف پیکر ہی نہیں عطا کرتے بلکہ اسے رومانی رنگ وآہنگ بھی عطا کرتے ہیں۔

داخلیت کے سبب ہی فطرت کی آغوش میں پہونچ کر اور خوبصورت مناظر میں کھو کر بھی شاعر افسردہ لی کی زد سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ وہ فطرت سے سروساماں حاصل کرنے کے بجائے فطرت کو ہی رنجیدہ خاطر کر رہا ہے۔

''اب بندھ گیا تار آنسوؤں کا
روتی ہے محبت سادگی سے
پر ہول مہیب دل کشی سے
نمناک ہوئے خار خاشاک
دل چاک ہوا کلی کلی کا
بڑھنے لگا درد زندگی کا '' [۱]

فطرت کے دلکش مناظر ہوں یا جنگ کی ہولناکیاں معاشرتی کشمکش ہو' یا تہذیبی پستی کا خلفشار، مذہبی اقدار کی شکستگی ہو یا تفرقہ سازی' سبھی موضوعات میں انسانی بے مائگی بے بسی اور بے ضابطگی کے نقوش نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ زاہد ڈار نے بجا طور کہا ہے:-

''وہ پورا شہر ایک گھپ اندھیرے میں جی رہا ہے اور
یہاں کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ
اندھیرا اک گرہن کی وجہ سے ہے

---

[۱] ''برسات کی رات'' قیوم نظر [۲] ''ایک نظم'' زاہد ڈار

نفرت کا گرہن
جوشہر میں رہنے والوں کے
بیچ آ کرٹھہر سا گیا ہے''۲؎

کائنات کے لا ینحل مسائل آئے دن الجھتے ہی جا رہے ہیں آج کی تخلیقی نظموں میں یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے کہ انسانیت اپنے ماحول سے اور انسان اپنی ذات سے متصادم ہے۔ ہر جانب یاسیت اور محرومی کے نظارے عام ہیں ہر چہرہ چراغ مفلس کی تعبیر ہے اور ہر حیات بیقرار ہے۔ یہ نکتہ کسی خاص فلسفیانہ نظریات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ٹوٹتی خوشیوں اور شکستہ سانسوں کے سبب ہے۔

''ہمارے یہاں ہر شئے کی طرح
وقت بھی کم تو لتے ہیں اور اسے زیادہ بتا کر بیچتے ہیں
شاید
اسی وجہ سے ہمارے لوگوں کی عمروں میں غیر معمولی طور پر
کمی ہوتی جارہی ہے وہ اپنی زندگیاں پوری طرح نہیں جی پارہے ہیں
انکی خوشیاں انکی سانسوں کی طرح بیچ میں
ہی ٹوٹ رہی ہیں''۱؎

آپ اگر کسی تنقیدی ضرورت کے سبب عاجز ہیں تو اس شعری تخلیقیت کو داخلی کیفیت کا نام دے سکتے ہیں، شعری تنقید اپنے روز اول سے ہی قلبی وارداتوں اور ذہنی حادثوں کو داخلی کیفیت سے عبارت کرتی چلی آرہی ہے۔ لیکن فی زمانہ تخلیقی نظمیں داخلی کیفیات، غم ونشاط یا خوف وہراس اور حوصلہ وغیرہ کے امتزاجی آہنگ وتاثر کو پیش کرتی ہیں کہ قلم عاجز ہے کہ کہے تو کیا

کہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کی تخلیقیت کے نمونے پیش نگاہ ہیں۔ملاحظہ کیجئے۔

'' حجاب وخوف قیاس درجا کے شبنمی شعلے
میں انکے قید سلاسل میں بند مہر بہ لب
کس طرح لب گفتار وا کیا۔وہی سوجھی
جو دل میں تھی ہی نہیں۔''

یہی رنگ وآہنگ آپ کے مابعد جدید شعراء کا عام وطیرہ ہے کہ:-

''وہی سوجھی
جو دل میں تھی ہی نہیں''

داخلیت پسندی کے ان رجحانات نے جدید اردو نظم کو ہر پہلو سے متاثر کیا ہے جو بیشتر شعراء کے یہاں ایک منفرد زاویہ سے موجود ہیں ان شعراء نے اپنے شعری ذوق وشخصیت کے تحت مختلف ردعمل کا اظہار کیا۔مثلاً میراجی نے خود کو آغوش زمین میں ہی پوشیدہ رکھنا چاہا۔ن م راشد نے ناسازگاریٔ حالات او میکانکل طرز عمل کے خلاف بغاوت کو سراہا۔ اسکے برعکس فیض نے عاشقانہ محرومی کے سایوں کو تابناک مستقبل کی امید سے بڑی حد تک دور رکھنے کی سعی کی دیگر جدید ترین شعراء کے یہاں بھی ان داخلی کیفیات کا تذکرہ سرگرم ہے۔ یوسف ظفر کے یہاں ان داخلیات کی 'نمونے زندان' اور 'زہرقند' میں ہوئی ہے جس میں ایک کہرام سا برپا ہے یہ ہنگامہ آرائی دراصل انکی تہہ وبند خواہشوں نے کر رکھی تھی جسکی وجہ سے انکی رحانیت سلب ہو رہی تھی حالانکہ اس روحانی منزل کی تلاش طلب نے بارہا ان خواہشات کو آنے

والی سحر کا نام دیا ہے۔ غالباً یہ پہلا تجربہ تھا جب شاعر نے خارجی اشکال کے پس منظر میں روحانیت کا پرتو دیکھا۔اسی تجربے کو یوسف ظفر نے یوں بیان کیا۔

''شفق کی دلہن جھانک کر دیکھتی ہے
مجھے دیکھتی ہے''
میرے دل کے بجھتے ہوئے شعلوں کی پیکار پرواز کو دیکھتی ہے
یہ زندگی جو ودیعت ہوئی تھی کہ ہر سمت سیلاب نغمہ بہارے
حصول مسرت کی خاطر ہر اک سنگ خار کو اک مرمری بت بنا دے
وہ بت جو ہر اک تان پر مسکرادے ہر اک سمت سیلاب نغمہ بہا دے
مگر اب یہی زندگی بجھ رہی ہے۔زمانے کے بیتاب آب رواں میں
''شفق کی دلہن جھانک کر دیکھتی ہے
کسے دیکھتی ہے؟ مجھے دیکھتی ہے!''

'صدا بہ صحرا' میں یوسف ظفر ایک ایسے مقام پر نظر آتے ہیں جہاں وہ داخلی اور خارجی دونوں ہی خصائص سے جکڑے ہوئے ہیں۔لیکن دوسری جانب انھیں سے امید وبیم کی ایک ایسی کرن بھی نظر آ رہی ہے۔ جو روحانی طہارت اور شفاف دل ہونے پر دال ہے۔ 'صدا بہ صحرا' کی نظموں میں ایک ایسی کسک اور روحانی تجربہ ہے جو شعراء کے یہاں ہے کمیاب ہے یہی نادر عنصر شعر یوسف ظفر کو خواص میں داخل کرتا ہے۔ان کے قلم کا جوہر دیدنی ہے ملاحظہ کیجئے۔

''مرے لئے جیسے تری دنیا میں کچھ نہیں ہے
بس ایک یہ چاندنی ہے جسکی ادائے بیگانہ بھا گئی ہے
جو میرے دل پر، مری نظر پر، مری تمنا پہ چھا گئی ہے

---

۱ ''شکایت'' یوسف ظفر ۲ ''ارمان'' یوسف ظفر

مرے خدا۔ تو ہر ایک دل کی پکار سنتا ہے، میری سن لے
مرے بھی دامن کو اپنی اس چاندنی سے بھر دے
یہ چاندنی لازوال کر دے'' ۲

یوسف ظفر اس نظم میں خدا سے ایک ایسی روشنی کے خواستگار ہیں جو انکی روح کو منور اور انکے نفس کو مجلی کر دے۔ اکثر شعراء نے داخلیت کو اپنی شاعری کا مظہر بنا کر انسانی خلفشار و کرب کی مختلف کیفیات کو اسی مقصد کے لئے استعمال کیا ہے جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ رفعت روش، شاذ تمکنت شریار ندا فاضلی کمار پاشی فضل قابش عین رشید وغیرہ ان کیفیات کا اظہار کرنے میں پیش پیش ہیں۔

''زمستاں کی رت، نیم شب برف باری
یہ حد نظر تھرتھراتی ہوئی لو
فضائے دل و جاں کی شیون گزاری
درخشان رفتہ ہواؤں کی زو پر
خزاں دیدہ پتے سسکتے ہوئے سے
ٹھٹھرتی ہوئی چاندنی، کانپتی ضو
دریچوں کے شیشے درکتے ہوئے سے
کوئی چیخ آواز' جھنکار' نغمہ
روانئ خون گلو تھم رہی ہے
کریدو انگیٹھی کا سینہ کریدو
مری آگ پر راکھ سی جم رہی ہے'' ۱

''نوحہ ان کا نہیں

---

۱ ''برف باری'' شاذ تمکنت

گزر گئے جو
زندگی کی اداس راہوں سے
پھینک کر بوجھ اپنے کندھوں کا
نوحہ ان کا
جواب بھی جیتے ہیں
جبر کو زندگی بنائے ہوئے
مرنے والوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے''

درحقیقت ہر نیا شاعر اپنی دنیا الگ بسانا چاہتا ہے۔ اپنے خیالات اعتقادات اور محسوسات کے اظہار کے لئے عجیب وغریب زاویہ نظر اور جدید استعاروں وتشبیہوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن اور دوسرے کی دنیا سے بے نیاز نظر آتا ہے لیکن اکثر وہ اسی بے نیازی میں عوام اور معاشرے کے بہت قریب چلا جاتا ہے جہاں پر اسے وقت کی ناسازگاری زندگی کی الم نصیبی اور مادی عناصر کی بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے وہ ایسے ماحول سے مطمئن ہوتا ہے جب اسے زندگی کے مختلف خوشگوار پہلوؤں سے بھی مسرت نہیں مل سکتی تو وہ مجبورٗ خود پسندی اور اپنی ذات کو مستحسن قرار دیتا ہے اور اسی مقام پر وہ تنہائی اجنبیت اور شکستہ ذات جیسے حالات کا شکار ہوتا ہے وہ تنہائی کے خوف سے ہراساں نہیں ہوتا بلکہ اسے ایک فرحت کا احساس ہوتا ہے کہ یکسوئی اسے غور وفکر کے لمحات مہیا کراتی ہے۔ لیکن یہی لمحات بسا اوقات اسکے لئے آزمائش بن جاتے ہیں جو زندگی کی تمام رعنائیوں کو ختم کر دیتے ہیں۔

”کتنے دنوں سے چاند اگا ہے
نہ سورج نکلا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے
رات رات بھر پانی برسے
دھول اڑے دن دن بھر
لوہارن لوہے کو پیٹے

بڑھئی بے چارہ لکڑی چیرے
میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر
نئی صراحی میں پانی بھی ندیا جیسا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے"[۱]

"کتنا تنہا ہوں میں کتنا تنہا
رات تاریک ستارے مغموم
سرد ہیں زہرہ و پرویں کے نگاہوں کے شرار
ہے فضاؤں کے شبستاں پہ تعطل کا حصار
اور یہ دشت جسے دیکھ کے ہیبت کو بھی خوف آ جائے
اپنی خاموشیٔ پیہم سے سرگرم کلام" ![۲]

دونوں نظمیں تنہائی و سکوت کا تجربہ خود اپنی ذات میں بکھرنے اپنے آپ سے دور ہو جانے اور پھر ہم کلام ہونے کے احساس سے عبارت ہیں چند مثالیں اور جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں:-

"رات کے زینۂ پیچاں سے اترنے لگی تنہائی میری
اس کے کتبے پہ تباہی کا یہ تازہ بوسہ
صرف بوسے کا نشاں باقی ہے
نیم جاں دائرۂ نوحہ گراں باقی ہے" [۳]

---

[۱] "بہت اندھیرا ہے" ندا فاضلی [۲] "پھیلے ہوئے ہاتھ" مظہر امام [۳] "محاصرہ" ساقی فاروقی

"ہر طرف پھیلی سفیدی کی خلا
دور تک نظروں کی حد سے بھی پرے
اک ازلی خاموشی
زندگی کے سارے ہنگاموں میں پنہاں
ایسی تنہائی کے سائے الٰہی
کون پہچانے کیسے اور کس لئے" ۱

"درد تنہائی کے نقش پا یہ چل کر گم ہوا
یارہ گزر میں چھپ گیا
جس طرح مضطر بگولے اپنی بے تابی سے عاجز
تھک کے صحرا میں بنا لیتے ہیں خود اپنا قرار
اک جلا ازلی خموشی
اور تنہائی میں پنہاں درد کی پرچھائیاں
کی یہی ہے کائنات این وآں " ۲

اس تنہارئی میں یعنی تہذیبی اقدر کے سائے میں دونوں زمانے ماضی اور حال سانس لیتے نظر آتے ہین ۔ فنکار کی نظر میں یہ دونوں زمانے سکون و مسرت سے عاری اور اانتشار و بے چینی سے پر ہے جہاں درد تنہائی میں اور تنہائی درد کی پیراہن ہے جس میں فنکار خود کو چھپائے نظر آتا ہے۔ بسا اوقات وہ تنہائی سے بیزار ہو کر جب کھلی فضاؤں میں نکلتا ہے تو وہ خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے اور اسکو احساس ہوتا ہے کہ جیسے اسکے گرد و پیش کا سارا ماحول اس سے نا آشنا

---

۱ ، ۲ نظمیں باقر مہدی

ہو۔اوراسی کیفیت کا ذکر.....الرحمٰن نے اپنی نظم 'گمشدہ' میں یوں کی اہے-:

''باوجواپنی شناسائی کے
مردوزن اجنبی سڑکیں بے نام
اورمنزل کا پتہ نا معلوم
کس طرف رخ کروں کس سے پوچھوں
ایک جیسے تھے مکیں ایک جیسے تھے مکاں
میں بھٹکتا تھا گلی کوچوں میں
راہ گم کردہ، سراسیماں، پریشاں صورت'' [۱]

فنکار کا یہ احساس اجنبیت قاری کو بھٹکنے پر مجبور کردیتا ہے ایسے ماحول میں جہاں سبھی اسکے نا آشنا اور ذاتی تشنگی کا شکار ہیں ایسے گم کردہ فضاؤں اور سراسیمہ ماحول میں اچانک وہ اس حقیقت کا سامنا کرتا ہے جہاں دائرے ہیں اورٹوٹتی لکیریں ہیں' باقر مہدی کے اشعارقابل دید ہیں۔

'' پھر ہمیں خیال آیا..............اپنے اپنے مرکز کا
دائروں میں چلتے تھے،ٹوٹتی لکیریں تھیں
ہم نے غور سے دیکھا ....!
آئینوں میں دھندلا ساعکس بھی نہ باقی تھا
ہم بھلا ملے کب تھے؟
ہم تو بس مسافر تھے'' [۲]

[۱] ''گمشدہ' منیب الرحمٰن [۲] ''اجنبی آشنا اجنبی'' باقر مہدی

باقر مہدی اس نظم میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس جہان فانی میں ہماری حیثیت صرف ایک مسافر جیسی ہے ملاقاتوں کا ایک دھندلا عکس بھی ہمارے ذہن میں نہیں رہتا۔ اور اکثر باہم تعارف کے لئے عمریں بھی ناکافی ہوتی ہیں۔ جدید شاعری کی جہد مسلسل کا مرکزی موضوع یہی مسئلہ ہے کہ حال کو کس طرح حسب حال بنایا جائے۔ گذشتہ دور میں جب فرد اور معاشرے کے مابین جذباتی فیصلے حائل نہ تھے فرد کے لئے معاشرے کو متاثر کرنا آسان تھا انفرادی اور اجتماعی رشتوں کے درمیان ایسی صورتیں موجود تھیں کہ فرد کو معاشرے سے دور رہ کر بھی فاصلے کا احساس نہیں ہوتا تھا، جسکا سبب یہ تھا جمالیاتی اقدار کے حسین لمحے جذباتی اعتبار سے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں ایک ذہنی تصادم چلنے لگا۔ اس تصادم نے شاعری کو ایک نیا وژن دیا ڈکشن دیا۔

جدید شاعری ماضی سے بیزار تو نظر آتی ہے لیکن مستقبل بھی اسے خوش آئند نہیں ملتا۔ بیشتر نظمیں اس ضمن میں ملتی ہیں کہ نیا شاعر جدیدیت کی راہیں نہیں ہموار کر رہا ہے بلکہ وہ ماضی اور حال کے پس و پیش میں الجھتا جا رہا ہے۔ جو اس تصادم ذہنی کا نتیجہ ہے جسے یہاں اجاگر کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے:-

"رات کٹتی ہے نہ لاتی ہے سحر کا سینا
بڑبڑاتا چلا جاتا ہے پھسلتا دریا
اک یہی ہونے نہ ہونے کا نشاں باقی ہے" [۱]

"وقت کا سیل رواں آیا وہ لمحات لئے
جو نہ گزریں گے نہ لائیں گے دل آویز سحر
مضمحل چاند رہیگا یوں ہی یہ رات لئے۔ [۲]

---

[۱] "رات بھر" قیوم نظر [۲] "بے خوابی" قیوم نظر

قیوم نظر کی بے نشان منزل ،گردش ارض کی مسکنت اور مضمحل مہتاب کی موجودگی اس تجزیاتی تحقیق کے نتائج پر اپنی مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں۔شاعر کی تخلیقی سریت میں ایسے بے شمار لمحات کا قافلہ آئے گا ، جو اسکے داخلی کرب کو فزوں کرتا رہے گا ، ہمیشہ باقی و پائندہ رہے گا لیکن کبھی بھی خوشگوار صبح امید نہ لا سکے گا اس شئے نایاب کو تنقید شعری قنوطیت کا نام نہ دے بلکہ دراصل یہی شعری تخلیقی سریت شاعری کا اجالا ہے۔ قیوم نظر کو ایسے نادیدہ جہان کی تخلیقات پیش کرنے میں سبقت حاصل ہے۔ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شعراء کو اپنے نصب العین کی مستحکمی اور افادیت پر پورا یقین ہے اور یہ دکھ بھی ہے کہ دلوں میں بے یقینی ہے لیکن وہ ماضی کے دلدل سے نکلنے کی جرأت رندانہ بھی کر رہا ہے بے شک نظر کا یہ تصور فن خارجی دنیا سے متاثر ہے لیکن داخلی احساس کی تپش بھی کچھ کم نہیں ۔دراصل یہ فنکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی زندگی کو کس نہج سے موضوع سخن بنائے خواہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں کس قدر تنہا کیوں نہ ہو:-

"تنہا راتیں کٹ نہ سکیں گی
تنہا منزل مل نہ سکے گی
پاؤں کے چھالے
دشت کے دل میں
پھول کی صورت کھل نہ سکیں گے
خون کی بارش رک نہ سکے گی
سناٹوں کے ہاتھ کے پتھر
ختم نہ ہوں گے
میں تنہا ہوں ،تم بھی تنہا
تنہا تنہا مر جائیں گے میں آتا ہوں تم بھی آؤ"

درد خلش اور کرب کی اس انتہائی صورت گری سے شاعر نے صورت حال کی سنگینی اور المیے کو پیش کیا ہے جسکا وہ خود بھی حصہ ہے قابل تعریف امر یہ کہ ٹھوس جدید امیجری کا استعمال جس فنّی تزئین کے ساتھ کیا گیا ہے بلاشبہ فی زمانہ آرٹ اوکرافٹ کی بین مثال ہے۔

بلراج کومل بھی اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ذاتی غموں کا اظہار کرتے رہے۔منیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اعظمی شہریار، زبیر رضوی اور دیگر شعراء کے یہاں بھی زندگی کی کشمکش کا اظہار رہا ہے ابتدائی دور میں خود پسندی، اپنے خوابوں سے وابستگی اور پھر انھیں خوابوں کی شکست کا اعتراف بھی ہے یہ کیفیات ان شعراء تک ہی محدود نہیں بلکہ ان جدید ترین شعراء کے یہاں بھی پائی جاتی ہے جنھوں نے غم جاں سے گریز کر کے انکشاف ذات کو اپنا موضوع بنایا۔ اور خود شکستگی کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے۔ یہاں چند مثالیں زیب قرطاس کی جارہی ہیں ملاحظہ کیجئے۔

"نظم کا موضوع پرانا ہو گیا ہے
خواہش جذبات محسوسات
ازلی اور ہمعصری
عدم میں منہدم ہو جائیں پھر ایک بار
میں مگر غربت کی تیغ تیز سے بچ کر
نکلنے کی سعی میں
آنے والے ناواجبی کے جال میں پھنسنے کا خاطر
بڑھ رہا ہوں
جال جس میں

---

[۱] ستیہ پال آنند

ہمیشہ کے لئے پابستہ ہو جاؤں گا شائد''[۱]

''کوچۂ ضعف سے قدمون کے تلے

زین بے ابر فلک ہے گویا

لب بریدہ ہیں شگفتہ یایں

شجر عمر گرتے ہیں

ہڑپ لیتی ہے پتوں کو زمیں''[۱]

''عجب بے دلی ہے

نہ آنکھوں میں خوابوں کی خوشبو

نہ سوچوں میں خود آگہی ہے

نہ لفظوں میں عکس معانی

نہ لہجے میں رخشندگی ہے

عجب بے یقینی کے احساس نے

مجھکو شرمندگی کے مفاہم سے آشنا کر دیا ہے

میں اپنے بدن کی بکھرتی ہوئی ریت پر

نیم مردہ پڑا ہوں

انا سے شکست انا تک برہنہ

طلب سے شکست دعا تک برہنہ

مسلسل تنہائی کا کرب' اجنبیت کا احساس' فنکار کی ذاتی شکستگی شرمندہ مفاہم

---

[۱] ''مرکز'' حمید الیاس

سے پیدا ایک بے یقینی ، دل وجگر وجاں کی مردنی اور انسانی انا کی برہنگی دراصل شکستہ ذات کے یہ عناصر احساس محرومی کے وہ منظر نامے ہیں' کہ اگر دیدہ ور کی نگاہ میں تاب ہے تو ان سے بصیرت وآگہی حاصل کرے اور فی الواقع اگر وجود بے معنی ہے تو خودکشی کرنے یا موت کی تمنا لئے زندگی گزار دے ۔ اس خیال کی توثیق میں ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کے خیالات زیب قرطاس ہیں :-

''موت کی شدید خواہش یا تمام سہاروں کے چھن جانے
کا یا تمام سہاروں سے قطع تعلق کر لینے کا منطقی انجام ہے
تمام ذہنی سہاروں سے قطع تعلق کر لینے کے بعد پھر فرد کی
ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی منزل کا آپ انتخاب کرے ۔
........................جب فرد بیچارگی کے احساس سے
دوچار ہوتا ہے تو انجام کار خودکشی میں پناہ لیتا ہے'' ۴۲

''یہی انجام ہوتا ہے فریب زیست کا آخر
پہاڑوں میں گھری وادی میں بل کھاتی ہوئی سڑکیں
گزرتے موڑ پہ جھکتی ہوئی
شاخوں سے پوچھیں گی
پرانے ماڈلوں کی گاڑیوں نے کیا کہا ان سے
مسافر خواہشوں کی منزلوں پہ بھی پہنچتے ہیں؟
یا رستے کی
کسی کھائی میں اپنے نام کی قبروں میں جا کر
لیٹ جاتے ہیں

---

۴۲ ''جدید اردو نظم نظریہ وعمل'' ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی ص ۳۷۲

یہ انجام ہوتا ہے فریب زیست کا آخر''

زندگی کی یہ فریب کاریاں شاعر کو فرض شناسی پر مجبور کرتی ہیں ۔فرض شناشی یا عرفان ذات کی سعی اکیسویں صدی میں سائنس وٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقیات اوراس سے پیدا شدہ نقصانات کے سبب خوف وہراس کے جذبے کا نتیجہ ہے جدید اسلحا جات کے ذریعہ معاشرتی معنویت کا احساس گم ہوتا جاتا ہے۔ڈاکٹر شمیم حنفی کا خیال ہے۔

'' جدیدیت کا فکری جواز مہیا کرنے والے تمام فلسفیانہ تصورات کی دیواریں انسانی مسائل کی اس پیچدگی پر قائم ہیں'' ۴۳

ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی نے اس ضمن میں اپنے خیالات یوں واضح کئے :۔

'' نئے شاعروں کی تنہائی جدید زندگی کا جبر ہے یہ تنہائی اپنی ذات اور شعور کے بعد کی منزل ہے انسان نے ماورائی خدا سے اپنا دامن چھڑالیا۔اور خدا کے مقابلے میں مشین پیدا کی ۔لیکن وہ خود اپنی تخلیق کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔مشین پر اسکا اختیار نہیں گویا زندگی کی رفتار پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں یہ احساس بیچارگی اور پھر یہ احساس بھی کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں ''بے چہرہ'' ہے تنہائی کے فطری اسباب ہیں ۔لیکن یہ تنہائی صرف فنکار تک محدود نہیں بلکہ یہ ہر فرد کا مقدر ہے اگر وہ حساس واقع ہوا ہے۔'' ۴۴

---

۴۳ ''نئی شعری روایت'' ڈاکٹر شمیم حنفی ص ۷۱ ۴۴ جدید اردو نظم ڈاکٹر عقیل احمد

اسی احساس نے فرد کو ہر لمحہ نئی سچائیوں کا سامنا کرنے اور حقائق سے متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اور ایسے حالات پیدا کئے جسمیں صرف حیر انگیزیاں اودلولہ خیزیاں ہوں۔ وہ کہنہ آہنگی کو ناپسند کرنے لگا اور یہ بخوبی سمجھے لگا کہ وہ اپنے وجود کے لئے کسی ماورائی طاقت کا دستنگر نہیں۔ بلکہ اسے وہ خود تخلیق کریگا۔

''میں اپنے جسم سے باہر نکل کے دیکھوں گا
یہ کائنات مجھے کس طرح کی لگتی ہے
فریب ذات کا احساس گو کہ اچھا ہے
بہت کٹھن ہے سفر آگہی کی منزل کا
بھٹک رہا ہوں میں صدیوں سے ایسی دنیا میں
جہاں پہ جسم سے ہو کر نکلنا پڑتا ہے
ہر اک خواب کو رستہ بدلنا پڑتا ہے'' ؎۱

؎۱ LUST فیصل ہاشمی

گذشتہ ادوار کی طرح ۱۹۷۰ء کے بعد شعراء کے یہاں بھی موضوعات کا تنوع ملتا ہے تمام شعراء کو کسی ایک نظریہ یا موضوع سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کچھ زیر بحث شعراء کا بیان ایک موضوع خصوصی ذکر کا متقاضی ہے کمار پاشی عنبر بہرائچی، صلاح الدین پرویز کو ہندوازم یا آریائی تہذیب سے غیر معمولی شغف ہے لیکن جنیت پرمار چندر بھان خیال اور ریاض لطیف قابل الذکر ہیں جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے میرے خیال سے جنیت پرمار نے اپنی نظم 'منو' میں پہلی بار معاشرے میں ذات پات یا طبقاتی کشمکش کی جو عکاسی کی ہے۔ وہ برسوں سے دیگر شعراء کرتے رہے ہیں لیکن اس نظم کو اردو شاعری میں دلت شاعری کی پہلی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس نظم میں پرمار نے براہ راست اور جارحانہ انداز سے روایتی برہمن واد کو چیلنج کیا ہے۔ آخری چند مصرعے 'منو' کے تخاطب میں یوں ہیں۔

"چمار بھنگی اور چنڈال کی تو نے لکھی تقدیر
گاؤں کے باہر رہتا اور
ٹوٹے برتن میں کھاتا
یہاں کا بھینسہ بھی پنڈت
گدھا بھی گنگا جل پیتا ہے
لیکن تجھکو ہے معلوم
اب میں نے چیل کی مانند اڑنا سیکھ لیا ہے
شیر کی مانند جست لگانا سیکھ لیا ہے

---

[۱] ''منو'' جنیت پرما

اک نہ اک دن
تیری کھال ادھڑ کے تیرے ہاتھ میں رکھ دوں گا
تو نے میرے باپ کو ننگا کر کے مارا تھا'' [۱]

اس مختصر سی نظم نے ذات پات پر مبنی پوری تہذیب و تاریخ کا احاطہ کرلیا ہے

اس سلسلے کی دوسری کافی طویل نظم چندر بھان خیال کی ہے ''ہاں وہ مسلمان تھے' ہے جو غالباً خالص ہندی تہذیبی شاعر دیوی پرشاد کی نظم 'مسلمان' کا ردعمل ہے یہ نظم ملک وقوم کے دشمنوں کی پرزور مخالفت ہے وہ لوگ جو وطن کے خودساختہ ٹھیکے دار بن بیٹھے ہیں اور جنھوں نے مذہب کے نام پر منافرت پھیلانے کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے ایسے حضرات کو خیاؔل نے منھ توڑ جواب دیا ہے۔

خیاؔل نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ہزار رسالہ قیام ملک کے تئیں خدمات ایثار وقربانیوں، معاشرتی حصہ داری اور پرخلوص جذبات اور ایسے ہی کئی پہلوؤں کو نہایت تفصیل سے اجاگر کیا ہے۔

''مسلمان نہ ہوتے
قبیلوں ورنوں طبقوں اور جاتیوں کے جنگل میں
تنفر کی آگ لگی ہوتی
جنگل جل چکا ہوتا
پھر آرکشن کی دھوپ میں کسے سینکتے
آرکشن کا وروِدھ کون کرتا
جمہوریت کی مینا کہاں چہچہاتی
سمتا سنتولن سماج سدھار شبد کوش میں
دھرے رہتے'' [۱]

---

[۱] ''ہاں وے مسلمان تھے'' چندر بھان خیاؔل

ریاض لطیف کی نظم بنارس بھی اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے مگر اس کی سطح الگ قسم کی ہے یوں تو غالب تا عزیز بنارسی درجنوں شعراء نے بنارس کو موضوع سخن بنایا ہے لیکن انھوں نے زیادہ تر بنارس کے ظاہر اور روایتی حسن کے قصیدے ہی پڑھے ہیں ریاض لطیف نے اپنی شاہکار نظم 'بنارس' میں اس امر سے گریز کیا ہے اور جدید طرز روش کو اپناتے ہوئے بنارس کی دیو مالائی حیثیت کو برسر کار لائے ہیں جس میں ہندو عقیدے کے مطابق بنارس کو اپنی طرز کا واحد مقدس شہر کہا ہے۔

''سبھی اپنی قدامت کے آثار
دھیرے سے اس میں بہانے لگے ہیں
سبھی اپنی اپنی فلک بوس تنہائی
ترے افق پر
سجانے لگے ہیں
کوئی راگ خاموش گانے لگے ہیں
مقدس بیاباں جسموں کے مرکز!
تری روح کے بیکراں سرد کونے میں
صدیاں غلاظت کئے جارہی ہیں
بنارس بنارس تیری سب مجردادائیں حسیں موت پاکر جئے جارہی ہیں'' [۱]

حالانکہ اس نظم میں وہ تاثرات وجذبات نہیں جو منو میں نظر آتے ہیں پھر بھی ریاض لطیف کی کوشش کامیاب ہے ان کی نظم جو کمپیوٹر عہد کے مدنظر وجود میں آئی

---

[۱] ''بنارس'' ریاض لطیف

'Cyber Space' بھی قابل تعریف ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب کی 'احساس جرم' بھی ایک اچھی نظم ہے جو ہندو ماتھولوجی کے پیش نظر لکھی گئی۔

''سرسوتی کو جب، میں نے
اپنے گھر میں استھاپت کیا
تو سوچا تھا
کہ اسکی آرادھنا کروں گا
سادھنا کروں گا
ور مانگوں گا اور پاؤں گا
لیکن مورتی کو شوکیس میں سجا کر
روزمرہ کے کاموں میں
مصروف ہو گیا
اور قریب قریب، بھول ہی گیا
کہ مرے گھر میں
سرسوتی کا پرویش بھی ہے''[۱]

کچھ اور شاعر جنھوں نے گذشتہ تیس برسوں میں اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی ہے ان میں ابراہیم اشک غیاث متین۔ فہمیدہ ریاض۔ بلقیس ظفیر الحسن، سلیم الرحمٰن ،رفیعہ شبنم عابدی وغیرہ کی نظموں میں بھی کافی رمق پائی جاتی ہے۔ یہ سارے شعراء ابھی تشکیلی دور سے گزر رہے ہیں ان کی رسائی کہاں تک ہے یہ فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔

فرقہ واریت انسان برادری میں رنگ و نسل کے نام پر جنگ یا مذہبی جدال وقتال آج کے شعراء کا مقدر ہے۔ یہ موضوعات شاعری کی تاریخ میں ہندوستان تک ہی محدود

---

[۱] ''احساس جرم'' پرتپال سنگھ بیتاب

نہیں بلکہ پورے برصغیر میں گناہ کی ریشہ دوانیوں کے سبب پھیلے ہوئے ہیں۔لیکن ایسے بیشمار شعراء کی فہرست تشکیل دی جاسکتی ہے جنکا ادبی قد ۱۹۶۰ء کے بعد اردو نظم نگاری کے منظرنامہ پر منعکس ہوا لیکن انہوں نے رنگ ونسل کی بحثوں سے ماورئ ہوکر بلکہ بلند و بالا ہوکر انسانی عظمت وشرافت کے آئینہ تراشے۔ بلاشبہ اردو ادب میں یہ فہرست جدید شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔حال میں صلاح الدین پرویز جیسے فنکاروں کا رجحان بھگتی تحریک اور قدیم ہندوستانی تہذیب وثقافت کی جانب بھی ہوا ہے'چوبیس گھنٹوں کے واقعات'' بارہ ماسہ' 'مائیکل انجلو' جیسی طویل نظمیں ہوں یا 'قصہ ایک دن کا' 'اب گھر چلو بھائی' جیسی مختصر نظمیں پرویز کی موضعاتی ااوراسلوبیاتی انفرادیت ہرجگہ پیش ہے۔

عنبر بہرائچی کا دائرہ فکروسخن بھی مطالعہ کی ایک کڑی ہے۔انھوں نے متنوع موضوعات اورجدید اسلوب کے اعتبار سے عنبر بہرائچی نے زیر بحث دور کی شاعری پر اپنے دیرپا اثرات ثبت کئے ہیں۔ان کے یہاں بھی اپنے مذہب کے ساتھ دیگر مذاہب خاص کر ہندو مذہب کا احترام بھی ہے'لم یات نظیر کفی نظر 'یدھشٹر'' کالی داس''اب تمہیں بتاؤ' جیسی نظمیں اسلام اور ہندوتہذیب سے واقفیت اور دلچسپی کا ثبوت ہیں ۱۹۷۰ء کے ابتدائی ادوار میں صنعتی سیاسی اور ثقافتی جبر کے اثرات اوراس سے پیدا ہوئی طبقاتی کشمکش کے موضوع جدید شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ روزمرہ کی عام زندگی یاریہات سے وابستہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی موضوع مخصوص بنایا اور مقامی بولیوں' ان کے اطوار وطریق سے اسفادہ حاصل کرکے شعری لفظیات کوانفرادیت عطا کردی۔

'' ادھر صبح صادق نے اجلے پہاڑوں پہ سونا لٹایا
چہکتے پرندوں نے فرط عقیدت سے
شان خدا کے قصیدے سنائے

اٹھی دودھ دہ کر مشقت کی پی کر
انڈیلا کنول رنگ مٹکی میں وہ دودھ شائستگی سے
جو کنڈے جلا کر مٹکی دہکتے الاؤ رکھی
وہ سوندھی مہک اڑ چلی، دور تک زندگی تھرتھرائی
لگی کوٹنے اوکھلی میں نیا دھان مسرور ہو کر
نکل آئے شفاف چاول
چمکنے لگے موتیوں سے [۱]

بظاہر اس نظم میں ایک عام جفاکش عورت کی معمولی تصویر نظر آتی ہے لیکن متعلقہ کردار اور اجزائے نظم کے جس پیکر کو پیش کیا ہے وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی ہے نظم میں پائی جانے والی نفسی شرافت ملائمیت اور کردار کی جدت قاری کو متحیر کر دیتی ہے۔ طبقاتی کشمکش کی برتری کا مظاہرہ یوسف ظفر کی اس نظم ارمان سے بھی خوب ہو رہا ہے۔

"میرے خدا..... مرے دل کا ارماں نہ سردسکوں کی روشنی
نہ گرم جسموں کی چاندنی ہے
نہ میں کسی مسند معلیٰ کا خانقاہی
کہ جس سے حاصل ہو کج کلاہی
مرے لئے جیسے تیری دنیا میں کچھ نہیں ہے
بس ایک یہ چاندنی ہے جسکی ادائے بیگانہ بھا گئی ہے" [۲]

ہم ادوار ماضی کا مطالعہ کریں یا عہد حاضر کے حالات کا معائینہ، ہمارا معاشرہ کسی نہ کسی زاویہ سے ذہنی کشمکش میں ملوث نظر آتا ہے جدید شاعر جب بیدار ہوتا ہے تو اسے

---

[۱] "نہائی ہوئی پسینہ میں آخر" عنبر بہرائچی [۲] "ارمان" یوسف ظفر

اپنے گرد و پیش ثقافتوں غلاظتوں اور ناہمواریوں کا انبوہ ناک منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہی جبر واستبداد' استحصالی' کشمکش اوران سے رونما ہونے والے اثرات ومظاہر اسکی شاعری میں ابھرنے لگے ہیں یہ واضح عمل اسکے حساس ذہن کے ردعمل کی ایک مخصوص ذہنی سطح کی مرہون منت ہوتے ہیں جو معاشرے کی داخلی اور ارضی جذبات سے متاثر ہوتے ہیں معاشرے میں رونما ہونے والے ہنگامی مسائل کے پس منظر میں نسل ورنگ اور مذہب کی کشمکش ہمیشہ جاری رہی۔ اور جدید شعراء سے یہ شکوہ کیا جارہا ہے کہ انھیں جنگ وجدل اور فسادات کے بیان کے لئے کافی مواد مل رہا ہے۔ لیکن اس ماحول کو آپ کیا کہیں گے؟ جہاں رات دن ایک ہی جنگ جاری ہو اور اس کی زد میں شعراء وقاری دونوں ہی آرہے ہوں اس کشمکش پر خالص انسانی نقطہ نظر سے۔ تخلیق کی جانے والی نظموں میں بلراج کومل کی نظمیں اردو شاعری میں کلاسکس کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔

"جلنے والے ہمیں تو تھے
ہم پرچم تھے
میری ماں اور میرے باپ
ننھا منا میرا بھائی اور میری گڑیا سی بہن
اور بھی تھے کچھ مرے اپنے
سبھی جلے اور راکھ ہوئے
وہ جو ذراہٹ کر گھر جلے تھے
سب کے سب تھے تماشائی
ناوابستہ سب محفوظ
میں زندہ ہوں
میں پرچم ہوں

ل LUST فیصل ہاشمی

شعلوں میں گم ہونے تک
سہراؤ نگا" [۱]

میں نے دشمن کے قبیلے کو
تارج کرتے ہوئے
باب اول لکھا
جب مرا
رنگ نفرت میں لپٹا ہوا قبیلہ
ہوا ایک سے دو میں تقسیم
تو دوسرا باب میں نے لکھا
ایک سے دو ہوا
دو سے پھر چار
اور چار سے آٹھ
اک سلسلہ تھا جو بڑھتا گیا
ایک تاریخ تو ہو چکی ہے رقم
سیل الواب میں
جو بھی باقی بچا
خاروخس کی طرح
آج سب بہہ گیا" [۲]

"ایک پراسکاسر

---

[۱] "پرچم جل رہے تھے" [۲] بلراج کومل

دوسری پر جگر
تیسری سے لٹکتا ہوا اسکا جذبوں سے معمور دل
اس کی آنتیں یہاں اسکی پھانکیں وہاں
اس کی اپنی صلیب، آج کوئی نہیں
دشت میں دور تک چیختیں آندھیاں
ختم اس کی ہوئی مشتہر داستاں''[۱]

بلراج کومل کی یہ نظمیں عہد حاضر میں پرتشدد واقعات سے متاثر ہوکر نہیں لکھیں گئی لیکن گجرات واحمد آباد میں جبر وتصادم کی جو مثالیں سامنے آئیں انکی عکس عکس تصویر ہیں۔

دسمبر ۱۹۹۲ء کے پس منظر میں علی سردار جعفری کی نظم 'ایودھیا' بھی بہت اعلیٰ پایہ نظم ہے اس نظم کا مناظر کافی وسیع ہے۔ ایودھیا کو ہندوستانی تہذیب وثقافت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دیگر جدید شعراء بھی اس معاشرتی سطح پر ادراک حقیقت، کرب احساس اور جذبہ تفادت سبھی اوصاف کو سمو کر ادبی جدلیات کے ذریعہ معاشرے میں جاری کشمکش کا سامنا کرتے ہیں۔ مجید امجد، وزیر آغا یوسف ظفر عمیق حنفی نے بھی معاشرتی ناہمواریوں میں بھی ازلی وابدی جستجو اور سیاحت کے سفر جاری رکھتے ہیں اور اس کشمکش کے اثر کو جسنے معاشرے کی روحانی کشش کو ختم کردیا ہے موضوع سخن بناتے ہیں۔

''تجربات کا گلخن نمو کا گورستان
یہ کائنات یہ لیل ونہار یہ افلاک
یہاں کے سارے سفید وسیاہ سرخ کبود.

---

۱ بلراج کومل ۲ ''میعار حسن'' یوسف ظفر

معابد اور تراشے ہوئے بتوں کے خدا
میری نگاہ نے بخشی ہے زندگی ان کو
میری نگاہ نہیں ہے تو ان میں خاک نہیں '' ۲؎

یوسف ظفر نے ساری کائنات کو محض انسانی دید کا کرشمہ قرار دیا ہے خارجی ماحول محض طالب دید ہیں ازلی ابدی تصادم ہر لحظہ انسانی حیات کا متغیر چہرہ ایک ایسے تصور کشمکش پر منہتج ہوتا ہے جس کی تقدیر ہی جنگ و جدل اور قتال ہے۔ یہ ہولنا کی مٹتی ہوئی اقدار غیرت حمیت اور استحکامیت بکھرتا ہوا نظم مساوات، لمحہ لمحہ یقین محکم' ایسے حالات میں تفریق یا کشمکش کو اگر انسان باہم بھلا دیں سب مل کر تہذیبی معاشرتی اصلاح و فلاح کے لئے یک سمتی اختیار کریں تو کوئی بھی طاقت انھیں پسپا نہیں کرسکتی۔

'' جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنا دکھ اٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں '' ۱؎

لیکن ظلم و جبر کا انجام ہی اسکا خاتمہ ہوتا ہے ایسا خاتمہ جو مظلوم کے لئے فتح کا مژدہ ہے۔ لیکن ابھی امتحان و آزمائش کی گھڑی باقی ہے' رات باقی ہے' ہوس کی ہولنا کیاں باقی ہیں۔

''ہم ظالم حاکم نہ وحشی درندے
بے بس روحیں جبر کا شکار
مشیعت کی چکی میں پستی ہوئی آوازیں۔

۱؎ ''پتھر کی دیوار'' علی سردار جعفری

تم فرد کی دھجیاں کر کے
ہوس کے لبادوں کو نیا رنگ پیرہن دو''

لیکن گھبراؤ نہیں، روز مکافات میں اب دیر نہیں، زمانہ بدلنے والا ہے۔ امیر شہر کا رزق بنے مظلوم انسان، اب اپنا حساب کرنے کو آنے والے ہیں اور استخوان شکستہ سر غرور کو محتاط کر رہے ہیں رہے ہیں۔

''امیر شہر کچھ بتا
وہ پھول جیسے لوگ کون تھے
کہ جنکے پیرہن کے سارے تار لٹ گئے
نفس نفس تھا جنکا مشک زاوہ گل ازار لٹ گئے
وہ بے قرار جسم و جاں ستم کشاں
رواں دواں شکار گردش زماں
وہ کس کا رزق ہو گئے؟
کہاں پہ جا کے سو گئے؟
وہ کس خلا میں کھو گئے؟'' [۲]

رفیعہ شبنم عابدی کی یہ نظم ''جو چپ رہے گی زبان خنجر'' فرقہ پرستی کے تحت ہونے والے اس ظلم و بربریت کا انعکاس ہے جو بھارت کی سرزمین پر آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ شاعرہ ان مظلوموں اور معصوموں کی تلاش میں سرگرداں ہے جو گردش زمانہ کا شکار ہو چکے وہ ان حکمرانوں سے انکی آماجگاہ کی نشاندہی چاہتی ہے جنھوں نے انھیں اپنی جور و ستم کا نشانہ بنایا تھا یہ نظم حاکم و محکوم اور مختار مجبور کے مابین ایسی کشمکش ہے جسے تاریخ ہر دور میں دہراتی رہی ہے۔

---

[۱] ''جو چپ رہے گی زبان خنجر'' رفیعہ شبنم عابدی

کاش! ہمیں اس سے نجات حاصل ہو۔

ترقی پسند شعراء کے یہاں طبقاتی کشمکش کے زیر اثر جو نعرہ بازی اور بلند آہنگی نظر آتی ہے وہ جدید ترین شعراء کے یہاں کم ہوتی دکھائی دیتی ہے دوراصل یہ محاسن اس دور کے اقتضاء تھے جب سرمایہ دارانہ نظام کا بول بالا تھا اور آزادی کے لئے کشمکش جاری تھی' ایسے حالات میں شعراء نے تخلیقی اظہار کے لئے انھیں موضوعات کو منتخب کیا۔ جن سے معاشرتی ڈھانچے پر کاری ضرب کی جا سکے۔ چنانچے انھوں نے سیاسی سماجی اور تہذیبی کشمکش کو ہی موضوع سخن بنایا اور معاشرتی صورت حال کا نقشہ ذہنی اور جذباتی تاثرات کی شکل میں پیش کیا۔

'' الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان بستے ہیں
غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی ''[۱]

''بتاؤ کیسے تم آسکو گے
مری گلی پہ تمام رستوں پہ آدمی کے لہو کی
چھینٹیں ہیں
جلتی لاشوں کی بو ہے
ملبے ہیں
بے سہارا غریب لوگوں کے
جھونپڑوں کے

---

[۱] ''انسان'' ن م راشد [۲]

بتاؤ کیسے تم آسکو گے
مری گلی تک''

یہ نظمیں معاشرے کے غریب وپست طبقے پر ہونے والی ناانصافیوں اورعدم مساوات کے شدید احساس کی غماز میں کہیں بھی عدل اجتماعی کا کوئی مظہر دکھائی نہیں پڑتا' ہر طرف اور ہر جا جلی لاشوں کی بو'اور جھوپڑوں کے مدفن دکھائی پڑتے ہیں بقول فنکار حتیٰ کہ میری اور تیری گلی میں بھی - الٰہی ! تو منصف حقیقی ہے ہمیں تیرے عدل کا انتظار ہے ایسی صورت حال شاعر کو مسلسل ایک ایسے تخلیقی سفر کے لئے آمادہ کرتی ہے جو اسے تمام وکمال مراحل فن سے بخوبی گزار سکے ، انہیں راستوں کی تلاش کرتے کرتے شاعری اکیسویں صدی میں پہونچ گئی کچھ پیچیدہ مسائل جیسے آزادی، سرمایہ داری مختلف نوع کی بیماریوں ناخواندگی خشک سالی باڑھ (پانی اور خون دونوں کی) وغیرہ ہمارے تعاقب میں ہیں ۔ عدم مساوات فرقہ واریت اور سیاسی وتہذیبی جنگ آج بھی شدت سے جاری ہے جس سے ایک عام انسان کی فتح ناممکن ہے ۔نیز افلاس' استحصال حقوق کی پامالی ناانصافی نے اس کمپیوٹرائزڈ دور میں بھی معاشرے کومزید کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔

''گھٹن سے کیوں پریشاں ہو
کہاں تم سر چھپاؤ گے؟
ابھی ٹھہرو
ذرا سوچو........!
تمہارے سر پہ حاوی ہو رہی ہے
ان چمنیوں کو بند کردو
تمہارا ہی لہوان چمنیوں سے
دھواں بن بن کے نیلے آسماں کو

ڈھک رہا ہے
ہوا ناپاک ہوتی جارہی ہے
فضا غمناک ہوتی جارہی ہے"

اس نظم کی بلند آہنگی مزدوروں میں اپنے خلاف ہونے والے استحصال اور ان پر مسلط محکوموں کے جبر واستبداد سے جذبۂ بیداری پیدا کرتی ہے جدید شاعری مزور کا لہولہو اور دھواں دھواں بنکر اپنی قسمت کے فیصلے خود کرنے لئے بزدآزما ہے۔

علی سردار جعفری کی نظم 'آنسوؤں کے چراغ' میں مہاجر عورتوں سے خطاب اس امر کی بین مثال پیش کرتا ہے ملاحظہ کیجئے،

" شریف بہنوں!
غیور ماؤں
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے؟
میں اپنے نغمے کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے"[۱]

یہاں جوش ہے، انقلابی نعروں کی گونج ہے اور جدلیاتی مادیت کے نقوش واضح ہیں لیکن یہ نکتہ خاطر نشان رکھنا چاہئے کہ بعض فنکاروں کی کچھ ترجیحات ہوتی ہیں ان کے فکر وفن کے بعض تحفظات ہوتے ہیں، بالخصوص ترقی پسند شعراء کے یہاں! اس نکتہ سے قطع نظر علی سردار جعفری' اپنے اظہار کلام میں کامیاب ہیں' ان کا لحجہ غمناک ہے' جس میں خلش وبیقراری اور آنسوؤں کا وفور ہے لیکن روحوں کی تابناکی کا مژدۂ جانفزا بھی ہے جو مدعائے تحقیق

ہے۔

بے رنگ ارضی زندگی سے جب ہم اکتا جاتے ہیں تو خیالوں اور خوابوں کی حسین وادیوں میں بھٹکنے لگتے ہیں حالانکہ زندگی کی بے کیفی اور بے رنگی میں بھی ہم جلوہ سامانیاں اور سرمستیاں پیدا کر سکتے ہیں لیکن شکستہ پا ہو جانا انسانی فطرت رہی ہے وہ آرزوں تمناؤں اور جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر ماورائیت میں پناہ کا متلاشی نظر آرہا ہے بظاہر یہ کام آسان نہیں ارضی زندگی یعنی داخلیت اور ماورائیت کے درمیان ایک ناقبل عبور فاصلہ ہے۔ لیکن شاعر ہر فاصلوں کو مختصر کرر ہا ہے اور ہزاروں مراحل طے کرتا ہوا وہ ماورائیت کی پر اسرار فضاؤں میں اپنی کمندیں ڈال رہا ہے:

میری ہمت دیکھیے اک دشت میں لیتا ہوں سانس
نقش پائے باد بھی جس دشت میں ملتا نہیں

جدلیاتی مادیت ہو نفس کی ہوسنا کی ہو، روحانی فضا ہو یا مابعدالطبعیاتی منظر نامہ، ایک عنصر مشترک ''بے قراری'' ہر جا موجود ہے اسباب الگ الگ ہو سکتے ہیں، اور ان کی موجودگی کی علت ومعلول کی بحثوں، ان کے نکتوں اور ان سے برآمد نتائج وغیرہ سب الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک کا پایا جانا، حیرت انگیز ہے اور وہ ہے، ''بے قراری'' اس بیقراری کو اضطراب' اضمحلال اضطرار اور عدم استحکام کا نام بھی دیا جا سکتا ہے لیکن بیقرراری کسی نہل ازم کا پیش خیمہ نہیں ہے اگر چہ اس میں رد تشکیل کے معنی نکلتے ہیں۔

ماورائیت تک رسائی کے لئے جدید شاعر اپنے جذبات کا سہارا نہ لیکر مابعدالطبعیاتی یا روحانی کیفیات کے متضاد پہلوؤں کو پیش نظر رکھتا ہے شمس الرحمٰن کا بیان ہے:۔

''ان کا مطالعہ رجحانات بیانات اور نظریات کی رو سے کہا ہی نہیں جا سکتا بلکہ ان تجربات کا ادراک صرف

روحانی سطح پر ہوسکتا ہے اگر ہم بیانات اور نظریات
کے سلاسل سے آزادی حاصل کرنے کی جرأت نہیں
رکھتے تو ماورائیت تک رسائی ناممکن'
''آسماں کی رفعت سے
میں زمیں پہ آیا ہوں
خود سے جو گریزاں ہوں
میں وہ ایک سایہ ہوں
لیکن اپنے دہن میں
گیت بھر کے لایا ہوں
بے سبب ہنسی اپنی
میں نے خود اڑائی ہے
ہر کسی سے دانستہ
ہنس کے مات کھائی ہے
بات خود مجھے اپنی
کب سمجھ میں آئی ہے
زندگی کے صحرا میں
میں بھی اک، بگولہ ہوں
آسماں کی وسعت میں
بجلیوں کا جھولا میں
کون جانے کیا کھویا
اور کیا میں بھولا ہوں

منتشر خیالوں کو
جال بن رہا ہوں میں
پھول چن لئے تم نے
خار چن رہا ہوں میں
آپ اپنے ہونٹوں کی
بات سن رہا ہوں میں "[1]

آسمان کی رفعت اور اسکی بلندی ایک جانب اور زمین کے خار اور منتشر خیالی کی فضا دوسری جانب' انسان ماورائیت اور مادی حقیقتوں کے درمیان ایک کھلونا بن کر رہ گیا ہے ۔ اسے اپنی موجودگی کا احساس ہے، وہ تنہائی میں بھی گفتگو کر سکتا ہے اور زندگی کے صحرا میں کبھی بگولہ کبھی بجلی بنکر ابھر سکتا ہے۔

شاعر اپنے خیالات اپنے تفکرات قاری کے حوالے سے پیش کرتا ہے ۔ وہ اپنے تخلیقی عمل میں قاری کو مدنظر رکھکر اسکے جذبات کو بھی ذہن نشین رکھتا ہے اسطرح قاری اور شاعر کا ایک حدتک جذباتی رشتہ ہوتا ہے جو قاری کی تنقید نگاری کے ذریعہ اور بھی استوار و ہموار ہوتا ہے اس باہمی رشتہ کے سبب ہی قاری اساس تنقید (Reader - Oriented Criticism) ساتویں دہے کے آخر میں تنقید ایک ہی قوت کے طور پر ابھرنا شروع ہوئی تنقید کا یہ انداز جدید تو نہیں لیکن اسکے تصورات اتنے متنوع ہیں کہ سب کو یکجا کرنا محال ہے قاری ہی اساس تنقید ہوتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں تخلیقات کی تفہیم و تشکیل میں قاری پوری طور سے شریک رہتا ہے اور یوں قاری کی شخصیت ایک مقتدر ہستی کے طور پر ابھرتی ہے ایسی ہستی جو وجدانی ہے اور ماورائی معنی کا سرچشمہ ہے۔

والٹر جے سلاٹوف Walter J. Slatoff نے اپنی کتاب - With

---

[1] "ماورئی" وشوناتھ درد

Respect to Readers(1970) میں تحریر کیا ہے کہ کسی بھی متن کے بارے میں یہ حکم صادر نہیں کیا جا سکتا کہ مستقبل میں متفرق ادوار سے وابستہ قارئین اسکو کسطرح پڑھیں گے متن کے اوصاف مقررہ یا ردعمل طے شدہ تفہیم وتشریح کی ضمانت نہیں لیتے بلکہ اس ردعمل میں قاری مکمل آزاد ہوتا ہے کہ کسی متن کو کس زاویہ نظر سے دیکھتا ہے اور کس حد تک وہ تفہیمی بصارت رکھتا ہے؟

ہر فرد مختلف ذوق و مذاق تجربہ وتربیت اور منفرد اقداری نظریہ رکھتا ہے شاعر کے ذہن تک پہونچنے میں ایک جرأت رندانہ کی ضرورت ہوتی ہے شاعری کا اچھا مذاق رکھنا' کامیاب قاری کا دلیل نہیں' ذوق شعری میں احساس حسن کے ساتھ زباں شناسی سخن فہمی روایت آگہی وغیرہ واجب ہوتی ہیں شعری ذوق حساس جذبہ کے بنا پر تاثرات کی شکل میں ابھرتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی وضاحت قابل ملاحظہ ہے' تحریر کرتے ہیں۔

> ''شعری ذوق کی تعریف جہاں جہاں بھی کی گئی ہے اور جس جس نے بھی کی ہے اول و آخر تاثراتی ہے اور تاثراتی تعریف منطقی نہیں ہوتی یعنی اس تجربی یا منطقی طور پر شعری ذوق کا عدم یا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا'' ۴۵؎

منفرد مزاج منفرد صلاحیت اور مختلف نفسیات کے بنا پر ایک ہی شئے مختلف مناظر میں نظر آتی ہے کبھی بھی ایک ضابطہ علم کے مابین بھی مختلف طور پر کیا جا سکتا ہے اسی طرح ایک ہی شعر کا قاری مختلف مطلب ومقصد اخذ کر سکتا ہے شعر پڑھتے ہی اپنا تاثر پیدا کرتا ہے کچھ فہم اور کچھ روشن منفی رویہ فوراً ہی یا کچھ دیر بعد مختلف انداز سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے قاری اپنے ذہن میں آنے والے خیالات اور جذبات کے اختلاط میں ربط پیدا کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس عمل میں ایک قاری دوسرے قاری سے مختلف اظہارات کا حامل ہوتا ہے نسل

۴۵؎ ''قاری اساس تنقید'' گوپی چند نارنگ ص ۱۲

اورعہد میں اختلاف ہونا تولازمی ہے، جوعہد درعہداورنسل درنسل چلتا رہا ہے۔

پچھلے ۳۰ سالوں میں قاری اساس تنقید کی نظریہ سازی پر جوکام ہوا ہے اس میں مختلف ملکوں کے ادیب شریک ہیں لیکن جرمن مفکرین سرفہرست آتے ہیں کیونکہ انھوں نے قاری اساس تنقید، یا قاری کی اہمیت کو کچھ زیادہ ہی اجاگر کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ کا خیال محل بیان ہے۔

'' متن کومعنی قاری پہنا تا ہے قاری اساس تنقید کے حامیوں کا کہنا ہے کہ شعر اگر چہ وجود رکھتا ہے لیکن اس وقت تک موجود نہیں بنتا جب تک پڑھا (یاسنانہ جائے) اخذمعنی کے لئے متن سے قاری (یاسامع) کا متصادم ہونا ضروری ہے متن میں کچھ نہ کچھ جگہیں خالی ہوتی ہیں جنھیں صرف قاری بھر سکتا ہے'' ۴۶

قاری کی تنقید سازی پر جوتحقیق ہوئی اس میں زیادہ تر کاوش جرمن مفکرین نے کیں ہیں جرمنی مفکروں کی نظریہ سازی تو فطرت کے بنا پر ہوئی ہے مگر تقویت اسے تفہمیت سے ملتی ہے تفہیم' چونکہ یہ لفظ بہت پہلے سے ہمارے سامنے موجود ہے اسلئے اسکے تذکرہ کواولیت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مظہریت اور اس سے پیدا ہونے والے نظریہ قبولیت کو'تفہمیت کا دائرہ عمل دوسرے ادبی نظریوں کی طرح محدود نہیں بلکہ جہاں تک معنی کی کارفرمائی ہے اور معنی کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہاں تک تفہمیت کی جلوہ گری ہے۔

مظہریت اور ساخیات کے فروغ کے ساتھ ادبی نظریات پر بیحد توجہ دی جارہی ہے جس میں تفہمیت بھی ازسرنو زیر بحث ہے مشرق میں سنسکرت اورعربی میں تفہمیت کی روایت خاصی قدیم ہے سنسکرت میں ویدوں کے متن کے تجزیے کی روایت یونانی تفہیمیت سے قبل رائج تھی اس طرح اسلامی روایت میں تفسیر حدیث اور فقہ کی بہت سی بحثیں ملتی ہیں لیکن

''قاری اساس تنقید'' گوپی چند نارنگ ص ۲۳

ہمارے ملک میں نہ اسے ازلی حیثیت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس زبردست ضرورت کی جانب کسی نے توجہ دی۔

مظہریت ایک فلسفیانہ رویہ ہے جو معنی اخذ کرنے میں دیکھنے والے Perceiver تفاعل پر زور دیتا ہے اسکو قائم کرنے کا سہرا جرمن فلسفی ایڈمنڈ ہوسرل (Edmund Husserl) کے سر ہے ہوسرل کے مطابق فلسفیانہ جستجو یہ ہے کہ ہمارا شعور کیا ہے؟ یہ نہیں کہ ہمارے اردگرد کیا ہے؟ ہم اپنے شعور کے ذریعہ ہی کسی نہ کسی شئے کو سمجھتے رہتے ہیں اور حقیقت سے متعارف ہوتے رہتے ہیں ہوسرل کا خیال ہے یہ عمل مظاہر کے ذریعہ ہوتا ہے جو ہمارے شعور میں ہیں اسی مظہریت کے ذریعہ ہی ہم اشیاء کی اصل صفات کا تعین کرتے ہیں جو عام خیال میں شعور کا کام ہوتا ہے مگر حقیقت میں مظہریت وہ قوت انسانی ہے جو انسانی شعور کو مظاہر کی اصل نوعیت سے آگاہ کرتی ہے۔ ادب وادیب کے سلسلے میں یہ روایتی نظریہ تھا کہ مصنف اپنے ذہن وشعور کی اہلیت پر ادب کا مطالعہ کرتا ہے لیکن مظہریت کی روشنی میں ان نظریات کے زاویہ تبدیل ہورہے ہیں اور خیال یہ ہے کہ ادب کے ذریعہ ہم ادباء کے ذہن وشعور کا مطالعہ کرتے ہیں گویا ادب مصنف کے ذہن تک رسائی میں ہماری مدد کرتا ہے اور ہم اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ اسکے شعور نے حقیقت کو سمجھنے میں کہاں تک باریابی حاصل کی۔

قاری اساس تنقید کو مظہریت کی بنیاد پر توسیع دینے اور اسے مقبولیت عطا کرنے میں جرمن نقاد دولف گانگ ایزر (Wolf Gang Iser) کو اولیت حاصل ہے وہ پہلا نقاد ہے جس نے صرف ایسے نظریہ کو قبول کیا۔ ایزر کی فکر کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ قرأت ایک طرح کا سابق ردعمل (Inraction) ہے جو ادبی متن کی ساخت اور اسکے اصول کنندہ (قاری کے درمیان واقع ہوتا ہے ایزر کہتا ہے کہ معنی نہ تو کاغذ پر چھپے ہوئے لفظ میں ہیں نہ متن سے باہر ہیں معنی تو قاری کے شعور میں پوشیدہ ہیں لہذا متن اور قاری دونوں قرأت کا ایک اہم حصہ ہیں وہ تحریر کرتا ہے کہ متن کی نوعیت میں یہ جزومضمر ہے کہ اس کو کس طرح سے پڑھا جاسکتا ہے جو

قاری کی فہمیت یا صلاحیت پر منحصر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ متن میں امکانات موجود ہیں جن کے بنا پر قاری معنی اخذ کرتا ہے لیکن اس عمل کے دوران قاری سابقہ رنگ آمیزی سے نہیں بچ سکتا، متن کا نقطۂ نظر اگر اجنبی ہے تو اسکو سمجھنے میں۔ قاری کو بہت ہی باریک بینی کی ضرورت ہوگی۔ اور اسے اپنے شعور کو کچھ زیادہ وسعت دینی ہوگی۔ نتیجتاً متن میں داخلی تبدیلیاں ممکن ہوسکتی ہیں۔ اسطرح قاری اپنے شعوری عمل کے ذریعہ پر قرأت سے کچھ نہ کچھ حاصل کرتا ہے اور اپنی تنقیدات کے وسیلے سے بہت کچھ ادباء کو دیتا ہے۔

شعر گوئی میں قاری خود متن کا پروردہ ہوتا ہے۔ متن کے پروردہ قاری سے مراد اس قاری سے ہے جو شعری روایت کے آداب واطوار سے بخوبی واقف ہو شاعری کے پس منظر اور شاعر کے داخلی حالات بھی شعری تفہیمت میں رہنمائی کرتے ہین اگر قاری ذہن رسا ہوا تو متن کی ساخت قاری کے تصور میں شعری نکات کو واضح کر دیتے ہیں یعنی یہ وہ تصور ہے جو بقول ایزرا پاؤنڈ متن کی طرز سے ابھرتا ہے یہ تصور مختلف ہوسکتے ہیں یعنی سخن فہمی کی کم از کم بنیادی صلاحیت، ذوق ظرف، شعوری فہمیت اور ترجیح ہوتی ہے۔

اردو کا شعری ذوق چونکہ نہایت بالیدہ اور نکھرا ہوا ہے صرف وہ نحود کے ردو بدل سے اور الفاظ کی معمولی ترمیم سے ایسے ایسے لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں جو غیر معمولی ہوتے ہیں، ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔

"قد کھنچے ہے جس وقت تو ہے طرفہ بلا تو

کہتا ہے ترا سایہ پری ہے کہ ہے کیا تو"

یہ میر کی سادگی ہی ہے کہ ان کی اس پرکاری میں سوا ہے کہ ایک بھی لفظ گھٹائے بڑھائے بغیر شعر کو نثر میں کیا جاسکتا ہے۔

''تو جس وقت قد کھینچے ہے تو طرفہ بلا (ہے)
ترا سایہ پری سے کہتا ہے کہ تو کیا ہے''

دیکھئے سارا شعری حسن ختم یعنی شعر کا حسن صرف اسکے نحو میں پوشیدہ ہے تسلیم کیا کہ فن شعر نثری نحو سے قریب تر ہوتا ہے لیکن یہ نکتہ خاطر نشان رہے کہ کلمے کی سطح پر الفاظ کے نہایت لطیف ردوبدل سے میرؔ شعر کو کس کمال تک پہونچا دیتے ہیں اور قدیاء سے وہ سماں پیش کیا ہے کہ قاری متحیر ہو کے رہ جاتا ہے اردو میں نحو کی تبدیلی سے شعریت کا گہرا تعلق ہے جو مصرعے کے اندر بھی ہو سکتا ہے اور مصرعوں کے باہر بھی اور اس سے ظاہر ہونے والا تاثر کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔

مراد یہ کہ قاری اساس تنقید نے ادبی شعریات میں ان مباحث کا احاطہ کیا ہے جس سے قاری اور قرأت کے عمل کو ایک ادبی حیثیت حاصل ہوتی ہے نیز قاری کی بالا دستی کو ماہرین ادب اور مفکرین نفسیات نے تسلیم کیا ہے۔

کسی بھی جدید ترین نظریہ کو بروئے کار لانا یا کسی جدید تحریک یا مشن کو چلانا متقدمین سے جنگ چھیڑنے کے مترادف ہے۔ شاعر یا ادیب اپنے نظریات پیش کر کے ہی فرائض سے سبک دوش نہیں ہوسکتا جب تک قارئین انکے خیالات سے متفق، متاثر نہ ہوں اگر قارئین اسکے تخلیقی عمل کو داد تحسین دیتے ہیں اور وہ اقتضائے زمانہ کے مطابق ہے تو یقیناً اسکو کامیابی ملے گی۔ بشرطیکہ وہ شعری جمالیات اور محاسن کو بھی مدنظر رکھے۔ ہر پیش رو رجحان اور تحریک کی طرح جدید شعری رجحانات کی بھی مخالفت کی گئی اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے جب کسی نئے رجحان یا تحریک کی ابتداء ہوتی ہے تو اسمیں شدت پسندی اور انتہا پسندی کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں اس طرح جدید شاعری نے بھی انتہا پسندی کا ثبوت دیا۔ آہستہ آہستہ انھیں اپنی خامی کا احساس ہو۔ اور جدید شاعری نے انتہا پسندی کے اندر ہی اپنا مقام متعین کرلیا۔

جدید شاعری کے ابتدائی دور میں بعض شعراء نے شدت پسندی کے جوش میں کچھ ایسے اشعار کہے جو معترضین کے لئے دلیل راہ بن گئے جن میں نہ شعریت ہی تھی اور نہ ہی جدیدیت کا صحیح مذاق۔ ممکن ہے کہ جدید شاعری کی ناہموار راہوں اور کمزور لمحات کا قصور رہا ہو کیونکہ ایسے ہی لمحات کی شاعری نے مخالف اور معترض فضاء تیار کی ان معترضین میں بیشتر ترقی پسند حضرات تھے۔ قابل اعتراض کہے جانے والے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

''نہ رستے میں کوئی سواری دکھی
نہ گھوڑے ملے ہنہناتے ہوئے ''

''چیل نے انڈا چھوڑ دیا

سورج آگرا چھت پر ''

''لوگ بولے اب نیا ہو جا پرانا پن اتار
میں کیا کرتا سر بازار ننگا ہو گیا''

''ایک لمحہ کے لئے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں'' [۱]

حقیقت میں یہ محض لفظوں کی پیوند کاریاں تھیں اس طرز نگارش میں نہ جدید شعراء ہی سنجیدہ تھے اور نہ ہی مخالفین غافل، اکثر و بیشتر شعراء کے یہاں کچھ غیر معیاری اشعار نظر آتے ہیں۔ اور قارئین کے تنقیدی زد حدف میں آتے رہے۔ فضیل جعفری نے درست کہا ہے۔

> '' چند خراب اشعار کو بنیاد بنا کر پوری شاعری کو رد کرنا کوئی اور فن تو ہوسکتا ہے تنقید نہیں۔ دلی کے لونڈوں کا تذکرہ....... سے میر کی عظمت میں کوئی حرف نہیں آتا۔ اسی طرح '' رکھتا ہے ضد سے کھینچ کر باہر لگن سے پاؤں '' یا ہے جو صاحب کے کف دست پہ چکنی ڈالی '' کو سامنے رکھ کر ہم غالبؔ کی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتے اور نہ گڑ بڑ غزل فراق کی عظمت کی داغ دار بنا سکتی ہے '' [۲]

حقیقیت یہ ہے کہ بعض ناقدین کے پیش نظر قاری کی نکتہ چینیوں کے پیچھے تحقیر کا جذبہ مضمر ہے ساتھ ہی ادبی حالات کی روش کو نہ سمجھنے کا شعور بھی داخل ہے نتیجتاً اظہار بیان

---

[۱] ''ایک نظم'' ن م راشد [۲] ''نئی غزل کا مزاج'' فضیل جعفری ص ۱۰۱

کے لئے کمزور اشعار مثال کے طور پر پیش کرنا اور اس سلسلے میں جدید شاعری پر اعتراضات کرنا عام وطیرہ بن گیا۔

معترض قاری نے پہلی آواز تو یہ بلند کی کہ معاشرہ ابھی مغربی درجہ تک نہیں پہونچ سکا ہے ابھی وہ حقیقی اور سائنسی فتوحات میں بہت پیچھے ہے پھر اسمیں وہ خامیاں کہاں ہیں جن سے پیداشدہ مسائل مثلاً رشتوں کا انقطاع اور ان میں انتشار و خلفشار، احساس تنہائی شکست ذات اجنبیت موت کا خوف ہمارے معاشرے میں موجود نہیں تو اسکا تذکرہ کیوں۔

لیکن ذرا ٹھہرئے! کیا یہی صورت حال اب ہمارے سامنے پیش پیش نہیں ہیں؟ انہیں عصری مسائل سے شہری زندگی اقتصادی سیاسی تہذیبی اور نفسیاتی کمزوریوں کا شکار ہورہی ہے تقریباً ۳۰ سالہ صنعتی ارتقاء میں شہری زندگی کے انتشار میں اضافہ ہی ہوا ہے اور یہ شہر مغربی تمدن اور مغربی ذہنیت کے مماثل نظر آتے ہیں۔ یہ مشینی دور کا ہی اثر ہے کہ ہمارے احساسات و جذبات مردہ ہوتے جارہے ہیں اور انسانی زندگی کی ارزانی اور بے وقعتی بڑھتی جارہی ہے اور تہذیب واخلاق میں پستی آتی جارہی ہے جنگ ومحاز کے اثرات اب کسی ایک ملک کے لئے مخصوص نہیں بلکہ انکے اثرات عالمی پیمانہ تک دیکھے جاسکتے ہیں ایسے حالات میں زندگی میں انتشار وخلفشار کا اظہار محض شاعری ہی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کی ترجمانی ہے۔ عمیق حنفی یوں صاحب طراز ہیں

''اس طرح بھیڑ کے میلے ٹھیلے میں
آدم زادوں کے ریلے میں
کیا حسن وادا کیا عشق وہوس
کیا خواہش وشوق اور کیا حسرت
کیا شرم وحیا۔ جرأت۔ غیرت
ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا

۱؎ عمیق حنفی

تنہا تنہا........ تنہا تنہا''[۱]

دوسرا اعتراض جدید شاعری پر تھا کہ نئے شعراء ایسی تخلیقات کرتے ہیں کہ جن کا مفہوم صرف انھیں تک محدود رہتا ہے عام قاری کی بات ہی کیا تعلیم یافتہ بھی ان کے مفہوم تک پہونچنے میں قاصر ہے۔ اسے بھی مغربی تقلید کہ کر ازلی زندگی سے لاتعلق بتایا گیا اور اسے کچھ قارئین نے مبہم ہی نہیں بلکہ مہمل قرار دیا۔

دراصل جدید شاعری میں شعراء کا ایک ایسا بھی گروہ ہے جنکا ماضی کی شعری زبان سے کوئی تعلق نہیں انھوں نے شاعری زبان کو لغوی اور نحوی آزادی بخشی وہ کسی ایسے اصول کے پابند نہیں رہنا چاہتے جن سے قدامت پسندی اور فرسودگی کی جھلک آئے وہ الفاظ کے ربط و اختلاط کے بجائے انھیں توڑ پھوڑ کر پیش کرنے کے قائل ہیں جسے وہ زبان وادب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں افتخار جالب، احمد ہمیش، عادل منصوری، انیس ناگی وغیرہ اسی ادبی صنف کے دائرے میں آتے ہیں یہ مختصر سا گروپ ہے جنکی شاعری سے تمام قاری اکثر وبیشتر محظوظ نہیں ہوتا پاتا۔ کیونکہ انکی علامتیں اتنی جدید ہوتی ہیں کہ انکے مفہوم عام قاری کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی یہی شاعری سرور وانبساط بخشنے کے بجائے مکلّف بن جاتی ہے لیکن انھوں نے صرف ایسی ہی شاعری نہیں کی بلکہ بہت ہی موثر اور شعریت سے بریز نظمیں بھی تخلیق کیں جن سے عام قاری بھی محظوظ ہوتا رہا ہے مثال کے طور پر چند نمونے ملاحظہ کریں۔

''اٹھو باؤلے اب تمھیں کس تمنا نے منزل کا دھوکا دیا ہے
کہ تم سانس کی اوٹ میں چپ کھڑے سوچتے ہو
یہاں ہر نفس بے صدا ہے
یہاں ہر گھڑی اب سسکتی سی زنجیر
ہر اک وفا تیرگی کا ستوں ہے
چلو خواہشیں ڈھونڈنے

---

[۱] ''خاموشی کا شہر'' انیس ناگی کتاب نما ص ۳۲۱

بن سنور کے چلو خواہشیں ڈھونڈ نی ہیں
نہیں تو یہی خاموشی بھوت بن کر
گھروں کے کواڑوں کے پیچھے ہمیشہ ڈراتی رہے گی'' [۱]

''تبوک آواز دے رہا ہے
زمیں سے اب جو چپک رہے گا
منافقوں میں شمار ہوگا
لہو کے سورج کی لال آنکھیں
اداس لمحوں کو سونگھتی ہیں
کھجور پکنے کا وقت بھی ہے
سفر کٹھن ہے
سواریاں اور سفر کا سامان ساتھ لے لو
سفر کٹھن ہے'' [۲]

اس گروپ میں تمام جدید شعراء نہیں آتے ان سے بڑا گروپ تو اعتدال پسندوں کا ہے جو جدید نظریات کے حامی تو ہیں لیکن انتہا پسندی کی حد سے پرے۔ ان میں وزیر آغا، باقر مہدی، کمار پاشی، قاضی سلیم، بدیع الزماں خاور، مظہر امام، فہمیدہ ریاض، شمیم حنفی، شمش الرحمٰن، مجید امجد، احمد فراز، ناصر کاظمی، قیوم نظر، یوسف ظفر فارغ بخاری وغیرہ کے نام شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اگر قاری یہ گلہ کرتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی عقل سے بالاتر ہے تو اسے تفہیمی صلاحیت ادبی شعور کا محاسبہ بھی کرنا چاہئے۔ کیونکہ شعر سمجھ میں نہ آئے یہ شاعری کی مذمت کے لئے ناکافی ہے چند اشعار یا نظموں کے بنا پر جدیدیت کو رد کرنا یا اسکی مذمت وتحقیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔

بہت ہی اہم الزام جو جدید شاعری پر آیا وہ جنسی بے راہ روی اور اسکا بے

---

[۱] عادل منصوری ذہن جدید ص ۱۲۶

حجابانہ اظہار بیان ہے دراصل ادب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے وہ ادب جو حقائق کا اظہار بیان نہ کر سکے وہ تاثرات کیسے قائم کر سکتا ہے دراصل جنس ایک حقیقیت ہے اور اس حقیقت سے رد گردانی کرنے کی جرأت کسی دور کے شعراء نہ کر سکے۔ فرائڈ ادب میں اسکا بیان بھی اشارے اور کنایے میں اور کبھی کھلے الفاظ سے ہر دور میں ہوتا رہا۔ اس غیر اخلاقی شئے کو اگر فنی لطافتوں اور شعری جمالیات کے ساتھ پیش کیا جائے تو غالبؔ میرؔ جیسے شاعر اور اگر ذرا بھی بے ارادنہ اور بے باکانہ اظہار ہوا تو جدید ترین شعراء کی فہرست تیار کی گئی۔ بقول فراق۔

> ''یہ خشک اوسر میں اگنے والے چیز تو نہیں۔ یہ تو دریائے معاصی کے کنارے کا درخت تھا جو مادہ پرستانہ نظریہ ادب کے تمام باغوں اور پارکوں میں نظر آتا ہے فرق صرف اتنا تھا کہ کہیں طوئفوں اور زنان بازاری کا ذکر خیر تو کہیں بریں گل سے چلمن رنگیں نظر آتی تھی'' ۴۸

فصیلؔ جعفری کی حقیقت نگاری حق بجانب ہے انکے الفاظ محل مطالعہ ہیں لکھتے ہیں:-

> خوشی کی بات ہے، نئے شاعروں نے جنس کو بطور استعارہ سماجی اور ثقافتی تنقید کے لئے بھی استعمال کیا ہے ساتھ ہی ساتھ جنس کے تعلق سے وہ ذہنی آوارگیاں اور جسمانی محرومیاں جو دراصل جدید تہذیب کے تحفے میں نئی شاعری کا موضوع بنی ہیں ''۴۹

نکتہ چینیوں اور اختلافات کے باوجود جدید ترین شاعری نے اپنا مقام متعین کر لیا ہے ساتھ ہی قارئین کو محظوظ کرنے کے فن میں بھی کامیاب ہے دراصل جدید شاعری نئی

---

۴۸ ایک مضمون فراق ۴۹ ''نئی شاعری اور جدیدیت'' فصیل جعفری ص ۶۳

سے نئی راہیں ہموار کر چکی ہے بنیادی طور پر یہ انفرادی کش مکش امتیاز وانحراف اور تجربات ومشاہدات کی شاعری ہے اسطرح کے تجربوں میں جوش وخروش، سنجیدگی وتفکر کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ باریک بینی فکر وگہرائی کی جانب رجحان بڑھتا ہے جاتا ہے جدید ترین شاعری میں بھی شعری محاسن اور قاری کو محظوظ کرنے کا فن ہی موجود نہیں یہ قاری کو محض وقتی لطف اندوزیاں ہی نہیں بخشتی بلکہ انھیں ادبی نظریات کے توسل سے حقائق کو سمجھنے اور ان سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرتی ہے چند اشعار

'' چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن
مرے وجود سے قائم موسموں کا سہاگ
میں کس طرح سے بھلا اپنے آپ کو بھولوں''

فیض احمد فیض نے جدید شاعری پر جن اعتراضات کو پیش کیا محل مطالعہ ہیں:۔

'' آج کل جو شاعری ہورہی ہے اسکا مجموعی نقشہ ہی نہیں بنا ہے۔ اس لئے شاعری کی ترتیب دریافت کرنا ہی ممکن نہیں۔ ادب مطالع اور مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جدیدیت کے حامیوں کے یہاں یہ دونوں عنقا ہیں'' [۵۰]

فرائڈ کا خیال ہے کہ انسانی زندگی میں جنس ایک ایسا محرک ہے جو انسان کے تمام حرکات وسکنات میں موجود ہے جو مختلف سطحوں پر مختلف حالات میں مختلف عنوانات سے

---

۵۰ ''ایک مضمون'' فیض احمد فیض

نمودار ہوئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس شدت سے یہ بات ادبی حلقہ میں ابھری ہے اور جو اختلافات ادبی حیثیت سے کئے جاتے ہیں وہ اور کہیں نظر نہیں آتے ۔ فرائڈ کے افکار ونظریات کا انعکاس میرا جی میں بدرجہ اتم موجود ہے جسکی مثال ان کی شعری اور تنقیدی کاوشیں بنیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ فرائڈ کے نظریات کو میرا جی نے نئی نفسیات کا نام دیکر بعض تنقیدی نظریات پیش کئے ہیں ۔

اعتقاد کے رو سے جدید نظموں میں شاعر خوبصورت الفاظ کے ذریعہ وہ دلنشیں انداز بیان اختیار کرتا ہے کہ نثر ونظم کا امتیاز ختم ہونے لگتا ہے ۔ وہ ان دونوں صورتوں سے فائدہ اٹھا کر ایک جدید قوت کا سہارے اثر آفرینی اور رنگ آمیزی میں اضافہ کرتا ہے ۔ یہ نظمیں بہت خوبصورتی کے ساتھ مختلف مدارج طے کرتی ہوئیں اختتام پر پہونچتی ہیں اور قاری پر ایک نہ ختم ہونے ہولا تاثر چھوڑ جاتی ہیں ۔ یہ تاثر خیال ومعنی کے عمل میں قاری کے ذہن میں جاری رہتا ہے بظاہر یہ نظمیں عام فہم ہوتی ہیں مگر انکی تہہ داری ہمہ گیری ، رمزیت وافادیت معنی اور مفہوم کے اعتبار سے قاری کو محظوظ کرتی ہے جس نظم کو محض چند الفاظ کی تلاش سمجھا جاتا ہے انھیں الفاظ کو پیکر دینے کے لئے شاعر کو اپنے مشاہدات نظریات اور جذبات کا رنگ دینے میں کافی جدو جہد کرنی پڑتی ہے ۔ وہ اپنی صلاحیت اس مقصد کو حاصل کرنے مین صرف کرتا ہے کہ اول تا آخر تخلیق کو جدید تکنیک سے پیش کر سکے جسے پڑھکر قاری کو احساس ہو کہ نظم کی تخلیق از خود نہیں بلکہ طے شدہ کاوشوں کے بعد ہوتی ہے ۔

جدید شاعر فنی محاسن کو مدنظر رکھتا ہوا زبان کے مطالع رنگ وآہنگ تزئین وتمکنت قافیہ وساخت اور حالات وموافقیت کے مطابق وہ جلوسامانیاں پیش کرتا ہے جو تجنیس صوتی اور تجنیس خطی کی خوبیوں کے ساتھ انجام واختصار رکھتی ہیں کچھ قاری اسباب مذکورہ کی بنا پر ایسی نظموں کو غلطی سے ابہام گوئی کا نام دیتے ہیں ۔ ان میں تفہیمیت کی قوت اس درجہ تک نہیں ہوتی کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ جب خیالات میں وسعت اور وضاحت طرز نگارش میں ایجاز واختصار

جدید علامتوں کا استعمال اور عناصر خارجہ کو احساسات کے ذریعہ سپرد قلم کیا جائے تو شاعری میں یہی ایہام حسن صوتی وحسن معنوی میں افسانہ کرتا ہے۔ غالبؔ اور میرؔ کے قطع نظر اکثر بیشتر شعراء بلکہ اساتذہ کے کلام کا یہ موضوع ایک حصہ رہا۔ لکھنؤ کے شعراء کے یہاں تو لب ولہجہ بھی نسوانی مل جاتا ہے۔

''جوشؔ یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
آہ ان فصلوں میں آ کر اپنی رسوائی ہوئی''

''اسے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی
خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھائے گی
اے حسن صبا پرور شوخی بھی شرارت بھی''

'' ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی''

فراقؔ گورکھپوری کو بھی جنسی کشش نے مسحور کر رکھا ہے وہ کہتے ہیں :-

''میری ذاتی زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نئے شعوری اور وجدانی طور پر اسے گہرا بنانے کی کوشش کی ہے.................

ا ''فراق کے خطوط'' نقوش لاہور

.... پاکیزگی جنسی
تعلق سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق وجدانیت اور
جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے'' ۵۱

جمالیاتی جنسیت فن اور فنکار کی شاعری کو مستحکم کرتی ہے اس بات کا اعتراف ترقی پسند شعراء میں سب سے زیادہ فیض کو تھا حقیقیت تو یہ ہے کہ فیض رومان سے حقائق کی جانب آتے ہیں اس تخلیقی سفر میں انھوں نے زادراہ کے طور پر جمالیاتی وجدان کی منتخب کیا جو انکے ساتھ رہا فیض کی ایک نظم 'مرے ندیم' میں یہ جذبہ ملاحظہ ہو۔

'' وہ ناصبور نگاہیں'' وہ منتظر راہیں
وہ پاس ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں۔
وہ انتظار کی راہیں طویل تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں وہ مخملی باہیں
کہانیاں تھیں کہاں کھو گئی ہیں مرے ندیم'' ۱

یہی جمالیاتی احساس فیض کو اپنے ہمعصر شعراء سے ممتاز اور منفرد و مقام عطا کرتا ہے۔ راشد اور فیض نے بلاشبہ جدید نسل کو بے حد متاثر کیا ہے لیکن ان دونوں شعراء کو جن حیثیت سے پیش کیا گیا اس سے حقائق مسخ ہو جاتے ہیں ادھر بعض جدیدیت کے حامی فنکاروں نے تجربات کے جنون میں شاعری کو مشرقی فضا سے باہر کر دیا المیہ یہ رہا کہ انھوں نے اسے تنقید کا اعراز و معیار بنا لیا اور ہئیت کو مواد پر فوقیت دی شکر ہے کہ اب جدید ترین ذہن پورے اعتماد سے زندگی کے حقائق کو باریک نگاہی سے دیکھ رہا ہے اور زندگی کے تجربات و حقائق کو فنی سطح پر لا کر مواد اور ہیئت کی تفریق اور بندشوں سے رہا کرا رہا ہے.........جو بلاشبہ نئے فنکار وں کی نئی نعیں اور نئے آسمان کی تلاش و جستجو کی مثال ہے نیز آئندہ زمانوں کے لئے آئینہ ہے۔

---

۱ فیض احمد فیض

باب سوم

جدید ترین شعری جمالیاتکی نوعیت دریافت کرنے کے لئے اس طرز احساس کا مطالعہ کرنا بیحد ضروری ہو جاتا ہے جو جدیدیت کا بنیادی پہلو ہے ۷۰ء کے بعد ہی نئی شعری جمالیات کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے لیکن اس خیال سے نئے شعراء کا تیقن نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جدید نسل کا اختلاف ہمیشہ برقرار رہا ساتویں دہے سے آج تک کے اختلاف کو ہم تین نسلوں کا ختلاف کہہ سکتے ہیں جو ابتدائی دور کی بہ نسبت کم تو ہو لیکن ختم نہ ہو سکا پھر بھی ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ جدید ترین شعری جمالیات کو جدید تصورات عطا کرنے میں اس دور کے شعراء نے اہم رول ادا کیا موضوع کے ادراک اور اظہار میں فنکار کو مکمل آزادی بخشی خیالات وجذبات کی آزادی، رابطے وضابطے کی آزادی اور بندشوں وتراکیبوں کی آزادی یہی آزادی شاعر کو حقائق کا آزادانہ طور پر مشاہدہ کر کے جدید تجربے کی رغبت پیدا کرتی ہے۔

یعنی مشاہدہ اور تجربہ ایسے دو اہم عناصر ہیں جن پہ جدید شاعر اپنی شاعری کی بنا رکھتا ہے اور اسے اپنے ذوق افکار سے ہم آہنگ کر کے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے تصورات کو پیش کرتا ہے۔

"اک طفل مکتبی ہوں بہ دستور آج بھی

درس زمانہ

ہر روز لوح ذہن پر لکھتا ہوں کچھ حروف

دھوتا ہوں روز انکو نئی مشق کے لئے [1]

یعنی خوب سے خوب ترکی مشق جاری ہے سوال یہ ابھرتا ہے کہ وہ صفات جن

---

[1] "درس زمانہ" مغیب الرحمٰن شب خون ص ۷

کی موجودگی شعری جمالیات کے حصول کا ذریعہ نہیں کیا ہیں؟ گزرتے ہوئے دور اور بدلتے ہوئے ماحول میں یہ سوال ہمیشہ زیر بحث رہا کیونکہ تغیر پزیر تہذیب واقدار نے فرد کو اہمیت دی کبھی معاشرے کے خارجی تصورات کو پیش نظر رکھا اور کبھی داخلیت کی جانب توجہ دی لیکن ان سبھی ضرورتوں کے ساتھ موضوع کی معنویت کو رد نہیں کیا۔ شعری جمالیات ایک شعوری اور ارادی عمل ہے جو زبان وبیان کو حسن وتاثر عطا کرتا ہے شمس الرحمٰن فارقی کا خیال ہے کہ اجمال شعر کے بنیادی اجزا میں سے ایک ہے۔

دور جدید حسن اجمال کا پرستار ہوتا ہے جارہا ہے روزمرہ کی زندگی سے لے کر ادبی تخلیقات نے جدید شاعری کی نظریہ سازی کو متاثر کیا ہے جس کے نتیجہ میں مخصوص طریق استعمال رائج ہوا۔

''مصور!
یہ تیری تصویر جادو تھی
عجوبہ ہے کہ یہ اب سانس لیتی ہے
یہ شاید آدھی زندہ آدھی مردہ ہے
جو زندہ ہے، کبھی مرجاتی ہے
اور مردہ ہو جاتی ہے جب زندہ
تو یہ محسوس ہوتا ہے قیامت جاگ اٹھی ہے''[۱]

''پہاڑ چشمے کی دھار
بدوضع پتھروں کو
کھلی ڈھلانوں میں
شوخ لہروں کی انگلیوں سے

---

[۱] ''تصویر'' رفعت سروش قومی آواز [۲] ''یہ سلسلے ہیں کمال فن کے'' عنبر بہرائچی ذہن جدید

حسین پیکر میں ڈھالتی ہیں''
یہ سلسلے ہیں کمال فن کے''۲؎

مندرجہ مثالوں میں وہ تمام اجمال موجود ہیں جن کو شمس الرحمن فاروقی نے واضح انداز میں جدید شاعری کا جز بتایا ہے اپنے مضمون ''شعر غیر شعر'' میں شاعری کے نئے جدلیاتی الفاظ، ابہام اجمال تناسب اور توازن کو ہی شعری جمالیات قرار دیا ہے اس طرح جدلیاتی الفاظ اور ابہام یہ دونوں ایسے عناصر ہیں جنھیں شعری جمالیات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے یہی محاسن نظم کو نثر سے ممتاز کرتے اور یہی دونوں عناصر جدید ترین شاعری کے پیکر کی تشکیل کرتے ہیں۔

تشبیہ واستعارہ علامت وپیکر ان چاروں الفاظ سے ہی ادبی جدلیات وجود میں آتا ہے اور تخلیقی عمل کو مختلف پیکر میں پیش کرتا ہے شاعری میں روز افزوی پزیری انھیں ادبی جدلیات کی دین ہے۔

''آئندہ کے افسوس کے سائے لرزاں ہیں
مجھے قید خوف سے رہا کرو
میں اپنے درد کی ننگی دھوپ سے
گھٹی تسلی مانگ کر ہار گیا
(اے درد میرا فیصلہ کرو) مری خالی آنکھیں
منتظر منتظر بھٹک رہی ہیں
لڑکھڑا رہی ہیں
رہا کرو
مجھے خوابوں کی بیساکھی دو''

''سفر زندگی کی علامت ہے لیکن
سبھی راستے
کھوٹے سکوں کی طرح
مری جیب میں
جانے کب سے پڑے ہیں
ہواؤں میں میلا دھواں بھر گیا ہے
کئی سال پہلے میں ان سے ملا تھا
وہ سب جن کی راہوں میں تھی روشنی
انھوں نے کہا تھا
سفر زندگی کی علامت ہے
چلتے رہو مگر آج
جس جگہ آ گیا ہوں
وہاں کچھ نہیں ہے
ہواؤں میں میلا دھواں بھر گیا ہے'' ۱

''وہ پھول سے ڈرتی تھی
کہتی تھی
پھول تو زہریلے ہوتے ہیں
دور بھی ہوں تو ڈس لیتے ہیں
اسکی سولویں سالگرہ پر

---

۱ ''سفر زندگی کی علامت ہے'' شاہد عزیز ذہن جدید

میں نے اسکو
پھولوں کا تحفہ بھیجا'' !!

جدید ترین تراکیب والفاظ پیش کرنے کا رجحان آج کے شعراء میں اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ وہ اکثر شعری جمالیات کی تحدید سے تجاوز کر جاتے ہیں اور تخلیقی عمل میں انتہا پسندی تک پہونچ جاتے ہیں ۔ ان میں افتخار جالبؔ اور احمد ہمیش قابل ذکر ہیں قطع نظر علامتوں اوراستعاروں کے استعمال کے جمالیاتی سطح پر ان مین ایک حد تک اعتدال موجود ہے ان میں سے بیشتر شعراء نے اپنا ایک منفرد رنگ ومقام بنالیا ہے ان سبھی نے دیرینہ علامتوں اور بعض حالات میں نجی علامتوں کے ذریعہ اپنا شعری وقار بنائے رکھا ہے ۔ ایسے شعر بظاہر عقل سے ماوریٰ نظر آتے ہیں لیکن غور فکر کے بعد قاری تفہیم تک رسائی کر لیتا ہے ۔

''پرندے آ
مرے ہونٹوں کی شاخوں پر
مرے الفاظ پیلے ہو چکے ہیں
انھیں شاداب ہونے کی بشارت دے
پرندے آ
مری آنکھوں کے پنجڑوں میں
مرے سب خواب نیلے ہو چکے ہیں
انھیں اب دفن کرنے کی اجازت تے ''[۱]

''میں اسکا بندہ رعایا، غلام یا کہ پرستار
پائے بند ہوس عشق دلفگار کا قیدی
نہیں میں ان میں سے کچھ بھی مگر وہ شاہ ہے میرا

---

[۱] ''ایک پرندہ'' نصیر احمد ناصر

گدائے بے سروپا، سنگ برنشاں جبیں ہوں
اگر میں کچھ نہیں اسکا
مرا تو وہ سبھی کچھ ہے''

علامتی فنکار اکثر اختصار پسند ہوتا ہے بلکہ وہ مختصر نظم کہنے پر قدرت رکھتا ہے اگر چہ براہ راست بیان کرنے میں عموماً طول کلامی سے کام لینا پڑتا ہے مزید یہ کہ شعری علامت مختصر پیرایہ میں ترسیلی کردار ادا کرتی ہے اور شاذ علامتیں ایک ہی لفظ میں وہ کام کر جاتی ہے جو بے شمار مصرعے بھی ملکر نہیں کر سکتے رؤف خلش کی 'لمحہ فکر' اس ضمن میں پیش ہے جو بیحد خوبصورت تخلیقی نمونہ ہے۔

''ہمارے حصہ کی کی نیند ساری
ہمارے اجداد سو چکے ہیں
سلگتی آنکھوں میں ریت بھر کر
ہم اپنے سب خواب کھو چکے ہیں
شکستہ ساحل پہ کچھ گھروندے ہیں
جن پر ہردم وہی بکھرنے کا خوف طاری
نیلے کمپیوٹروں کے جبڑے
ذہانتوں کو اگل اگل کر
حسرتوں کا نصاب ترتیب دے رہے ہیں''[۱]

لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں جس قدر بظاہر دکھائی دیتا ہے علامت کی غیر ضروری اختصار پسندی نظم کو وہ معیار نہیں بخشتی جو شعری جمالیات عطا کرتی ہیں جدید شعراء کی اکثر نظمیں جملے بازی کی سطح سے اوپر نہیں آئیں کچھ پہلیاں بن جاتی ہیں کچھ کلمے اور کچھ الفاظ

---

[۱] ''لمحۂ فکر'' رؤف خلش

کی تک بندیاں

''زاہد ڈار نے اپنی ایک نظم میں ایسی شاعری پر یوں طنز کیا ہے

''شاعروں کے پاس لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ریت پر بکھرتے ہوئے خوابوں کے پھول
آسماں پر چاند کا ننگا بدن
گھاس کی خوشبو درختوں کی پکار
آندھیاں اور راستے
کشتیوں کے بادباں۔ جادو کے گیت ''[۱]

''تم
حد سے زیادہ خوبصورت ہو
تمہارے بدن کا چاند
میری رات میں
سمندروں کو بے قابو کرتا رہتا ہے
میں
تمہاری مہک
کسی جانور کی مانند
سونگھنا نہیں چاہتا ''[۲]

'' زندگی کو
زندگی کی مانند

---

[۱] زاہد ڈار [۲] ''میں اور تم '' مصطفٰے ارباب شب خون ص ۲۲۰

بسر کرلیا
وہ سب کچھ جو جاننا چاہئے
جان لیا
دیکھنا چاہئے
دیکھ لیا
کھانا چاہئے
کھالیا
جھیلنا چاہئے
جھیل لیا
اب چاہئے کہ
خاموشی سے مرلیا جائے
تاکہ
کوئی اور
جو آنے کے انتظار میں ہے
ان سب سے لطف
اندوز ہوسکے''[۱]

دراصل کسی خاص علامت کو پیش کرنے کا مقصد اس علامت تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ شاعر ہمارے روبرو ایک مخصوص ذہنی کیفیت کی تصویر پیش کرتا ہے ایک ایسی تصویر جو اسکی شخصیت اور اسکی تہذیب کے عامیاتی رجحان سے پیدا ہونے والی اسکی ذہنی کیفیت کی تصویر ہو ان علامتوں تشبیہوں اور استعاروں کا معیار کچھ حد تک قاری کی ذہنی سطحوں پر بھی

منحصر ہوتا ہے۔ کیونکہ ذہانت کے معیار سے شاعر اور قاری کے ذہن میں اختلاف وتضاد بھی ہوسکتا ہے اسی اختلاف اور تضاد کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے شعری جمالیات کا تعاون بے حد ضروری ہوجاتا ہے کیونکہ تشبیہات واستعارات اور علامات کے ذریعہ ہر شخص اپنے طور پر اپنے ذہنی معیار کے مطابق ایک ذہنی تصویر کا پیکر ڈھال کر شاعر کا پیغام بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ شاعروں کی جدید نسل کے الفاظ کی تراش وخراش میں جدید نظریہ اپنانے میں پرانے الفاظ کے معنی ومفہوم کو وسعت بخشی ہے۔ انسانی تجربات جذبات ومیلانات اور فطرت کے درمیان رابطہ قائم کیا جدید علامتوں کی وضع تشبیہات واستعارات میں جدت وندرت ک مرہون منت آج شاعری محض چند رسمی اصول وضوابط کی پابند نہ ہوکر عام وخاص کی دلچسپی کا سامان ہی نہیں فراہم کررہی ہے بلکہ انکی طرز زندگی کو بھی نئی راہیں اور نئی سمتیں دے رہی ہیں جدید شعری جمالیات کی تلاش تو ہر شاعر پر فرض ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس فرض کے پیش نظر ہی وہ اپنی شاعری کو عوام کی شاعری یا بامقصد شاعری کا نام دے سکتا ہے۔

بلراج کومل کے یہ خیالات بہت حد تک میرے خیال کی تائید کرتے ہیں:-

> ''نئی علامتوں کی تلاش وہ متبرک فرض ہے جو ہر شاعر پر عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ اس فرض کے ساتھ اسکی ذہنی جودت، قوت اختراع اور انفرادیت کا تعلق ہے لیکن اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ علامت پسند ہونے یا کہلانے سے ہر شاعر اور ہر شعری کارنامہ منفرد حیثیت اختیار کرلیتا ہے'' ۵۲؎

ایک شاعر کو صحیح معنوں میں شاعری کا درجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ شعر طرازی میں تمام شعری لوازم کو مد نظر رکھے اور مختلف تشبیہات واستعارات واشارے جیسے کو وہ

۵۲؎ ''ادب کی تلاش'' بلراج کومل ص ۹۷

ودشت ، میداں وریگ زار ، دریا وسمندر سے ہمارے سامنے زندگی کی ایک خوبصورت تصویر پیش کرے جدت طرازی کے وسیلہ سے ہی گزشتہ تین دہائیوں میں زندگی کی جوخوبصورت تصویر ہمارے سامنے آئی یا زندگی کا سامنا کرنے کی جو مستحکم العملی ہم میں پیدا ہوئی وہ جدید شاعری کا ہی کرشمہ ہے چند نظمیں بطور مثال ۔

''سواریون کا سلسلہ ہے دور تک
ہمک ہمک کے جھولتا
بڑے بڑے قدم
زمین گرم وسرد پر جما کے ڈالتا ہوا
قدم بڑھے تو میں بھی ساتھ چل پڑا
غبار کی طرح ....سواریاں رکیں
تو میں بھی رک گیا'' [۱]

''سکوت بے کراں
سناٹے میں مدغم
اجالوں کی طرف بڑھنے لگا ہے
گھٹن سے مرتعش ہے خواب فردا
تنفس بجھ رہا ہے
سویرا اونگھتی دیوار سے ٹکرا گیا ہے
برہنہ سر کھڑے دیوار و گنبد
فلک کو بے بسی سے تک رہے ہیں
کبوتر پھڑ پھڑا کر گر پڑے ہیں

---

[۱] ''قافلہ'' ساجد حمید

گماں غالب ہے صبح نو سے پہلے
توانا روح پنجرا لے اڑے گی
مجھے تم سے
بس اتنی سی شکایت ہے
کہ جب دن کے صحرا میں نکلتے ہو
سرابوں کو حقیقت جانتے ہو دھوپ سہتے ہو
عذابوں سے گزرتے ہو
چراغ شام جلتے ہی گھروں کو لوٹ آتے ہو
امید صبح میں سوتے ہو
نہ غیرت ہے نہ غصہ ہے
نہ تبدیلی کی خواہش ہے
مجھے تم سے
بس اتنی سی شکایت ہے'' [۱]

''سفر کی خواہش کسے نہیں ہے!
کوئی پرندوں کی طرح اڑنے کا آرزومند ہے
کوئی ڈاک کے لفافے کی طرح محتاط پابہ منزل
کسی کی پرواز تا افق
اور کسی کی مکتوب الیہ تک ہے
یہ اپنے اپنے ارادے اور توشہ سفر پر بھی منحصر ہے'' [۲]

---

[۱] ''گماں غالب ہے'' ساجد حمید [۲] ''سفر کی خواہش کسے نہیں ہے'' عطیہ پروین خودکلامی ص ۹۰

استعارات علامات کی یہ خوبصورت تصویریں ان شعراء کے علاوہ عادل منصوری، ساقی فاروقی ندافاضلی محمد علوی اور شہریار کے یہاں کثرت سے ملتی ہیں ان کے یہاں مربوط اور غیر مربوط علامات اور استعارات کی بے شمار پیکر پیش کئے گئے ہیں جن میں زندگی کے حقائق کے پیش نظر جدید ترین اختراع کی مصوری کی گئی ہے۔

''نیلی پیلی ہری گلابی
میں نے سب رنگین نقابیں
اپنی جیبوں میں بھر لی ہیں'' ۱

''وہ آبگینہ ہوں خواہشوں کا
کہ دھیرے دھیرے پگھل رہا ہے
یہ مری آنکھوں میں
کیسا صحرا ابھر رہا ہے۔'' ۲

''جسم کے چاروں طرف
درد کی تاریک فصیل
ذات کے جنس میں
کمھلائی آواز میری
غم کے یلغار سے دل بند ہوا۔۳''

جدید ترین شعراء کا نظریہ آفاقی نقطہ نظر کو اپنانا ہے۔ وہ اپنے مقصد میں

---

۱ ''نقابیں'' ندا فاضلی ۲ ''نوحہ'' ۳ ''محاصرہ'' ساقی فاروقی

کامیابی کے لئے واضح مقبول اور عام فہم علامتوں کے بجائے جدید امیجز اور جدید ترین علامتوں کا سہارا لینا ضروری سمجھتے ہیں جسکی طرف انیس ناگی نے یوں اشارہ کیا ہے۔

"ضروری ہے کہ شاعر نئے تصورات سے نہ صرف آگاہ
ہو بلکہ اپنے گرد کے مادی معروضات کو اپنے احساس اور
تخلیقی تجربے کا جز بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو"

علامتی اظہار کا ایک اہم طریقہ کار اسطور سازی ہے جدید شعراء نے اساطیر کے استعمال میں جو جدیدیت اختیار کی وہ اساطیر سے وابستہ قدیم صورت حال کے وساطت سے زندگی کو سمجھنے کا عمل ہے یہ عمل مراجعت پرست ماضی میں بھٹکنے کا عمل نہیں بلکہ وجود اور کائنات کا اصل راز کی جستجو ہی ان کا نصب العین ہے شرعہ کے بعد ہی شعراء کے نظریہ عمل میں وسعت آئی۔ جس نے اساطیر سازی میں آفاقی نقطۂ نظر اختیار کرلیا ان شعراء نے اسے خود اپنی تہذیب اور اپنے ملک تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اکثر آفاقی اسطور کا سہارا بھی لیا ہے اور انھیں کامیابی بھی ملی بعض نے صرف اپنی تہذیب یا نیم تاریخی واقعات کے علامتی استعمال سے ہی اپنا درجہ متیعن کی ا۔عمیق حنفی، منیب الرحمٰن، رفیعہ شبنم عابدی، شہریار، بلقیس، ظفر الحسن اسلامی روایت، تاریخی قصوں کا اساطیری استعمال میں سند باد شہرزاد دسمبر ۹۲ ءوغیرہ نظمیں شہرت کی حامل ہیں۔

"سیاہ پھن سارے چاند تارے نگل گئے ہیں
سیاہ منظر..................سیاہ سے بھی سیاہ تر
روشنی کا نام ونشاں نہیں
زندگی تہہ کدے میں دبکی ہوئی ہے
جلے مکانوں سے اٹھ رہا ہے دھواں ڈراسا

ہوانے اسکو روند ڈالا ''[۱]

واہوئے ناگاہ اسکے ہونٹ اور الفاظ پانی کی طرح انسے رواں تھے
لوگ سن کر دم بخود تھے
جسمیں اعجاز خداوندی مجسم ہو گئے تھے
لفظ دریا تھا شجر تھا
لفظ شاخ پر ثمر تھا
لفظ دشت وکوہ طوفان وہوا تھا
لفظ انساں تھا فرشتہ تھا خدا تھا ''[۲]

ساتویں دہے سے اب تک جس اساطیر سازی تک ہماری رسائی ہوئی اس سے اس نتیجہ برآمد ہوا کہ جدید نظم میں اساطیری استعمال اس طرح نہیں ہوا کہ وہ علامتی تجربہ خوبصورت انداز بن جائے اسطور سازی میں ذاتی اور اجتماعی دونوں ہی اعتبار سے وہ صلاحیت ہونی چاہیئے جو ہمارے جدید تصورات واعتقاد کا احاطہ کر لے۔ شمش الرحمٰن فاروقی ،شہر یار پر ایک تنقیدی مضمون میں یوں رقمطراز ہیں۔

''شہر یار کی شاعری جس طرح ہمارے آرکی ٹائپ کے احساس کو متحرک کرتی ہے اسکی دلیل نظموں میں بھی مل جاتی ہے مثلاً رات کی زد سے بھاگتا ہوا دن اور عہد حاضر کی دلربا مخلوق) جو بظاہر ہر روز مرہ کی زندگی سے متعلق ہیں کیونکہ ان نظموں میں بھی شہری ماحول میں سورج کا سفر اور جدید عہد کی عورت مرد جو چھوٹی موٹی خریداریوں

---

[۱] ''دسمبر ۹۲'' بلقیس ظفیر الحسن ۵۳ [۲] ''سکوت سنگ اور صحرائے درد'' الفاظ جولائی تا اکتوبر شمس الرحمٰن فاروقی ص ۱۸۰

اور چھوٹے موٹے خوابوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہمارے
زمانے کے آرکی ٹائپ میں ان کا تذکرہ محض تصورات
(Concepts) نہیں بلکہ اعتقاد (Beliefs) کو بھی
کھینچ لاتا ہے۔'' ۵۳

فاروقی نے شہریار کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا اس کا ماحصل یہی ہے کہ وہ انسانی روح کی آرکی ٹائپ ہیں ان میں تاریخ حاضرہ کو سمو لینے کی صلاحیت ہے یہ الفاظ انسانی زندگی کا ماضی بھی ہیں اور حالیہ تجربوں کی علامت بھی اساطیر سازی کا یہ جدید تجربہ ہماری شاعری کے لئے ایک قابل قدر دریافت ہے کیونکہ ان کی مدد سے جدید شعراء نے اشترا کی اطوار سے ایسی علامتیں یا استعارے تخلیق کئے جو شعر یا نظم کی پوری فضا کے ساتھ مل کر ایک جدید عہد کی امیج بنانے میں کامیاب ہیں۔ بالیقین یہ شعری جمالیات کے اہم ترین اجزاء ہیں جن کی عدم موجودگی میں جدیدیت کا ارتقاء محال ہے۔

مشرقی طرز زندگی میں روحانیت یا اقدار کی جو اہمیت ہونی چاہئے وہ یا ختم ہو چکی ہے یا ختم ہوتی جارہی ہے۔ اس مادیت کے روز افزوں ترقیات نے فرد اور جماعت دونوں کی زندگی کو متاثر کیا ہے بلکہ اس ذہن و دل کو بھی متاثر کیا ہے جسکے سبب وہ اپنا جذباتی توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اب اقدار کے سہارے زندگی گزارنا اسے مشکل نظر آرہا ہے۔ مادی فروغ بھی ہر ایک کے دست رس میں نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے اور شعراء کے مابین کچھ مسئلہ ابھرنے لگتے ہیں۔

ہماری جدید شاعری کا بنیادی مسئلہ اقدار کے جمود وانحطاط کا مسئلہ ہے جو رفتہ رفتہ قدر و اہمیت کھوتی جارہی ہیں۔ جدید ترین تہذیب و تمدن ہمیں جسمانی لذتیں اور آسائش تو فراہم کر سکتی ہیں لیکن روحانی تقویت نہیں، نتیجتاً ہمارے اور ہماری روح کے درمیان ایک خلا ابھرتا جارہا ہے اس خلا کو پر کرنا یعنی وجودیت کی تلاش ہی اس دور کا اہم مسئلہ ہے۔

''زوال آمادہ صورتوں کو سنبھال رکھنا
میرے رفیقوں کے زخم خوردہ اناؤ کا
تم خیال رکھنا
گزشتہ دور کے امیں ہو
ہر ایک لمحے پر اپنی نظر بہ حال رکھنا
پھر اسکے بعد ایک ایک کر کے
جو ہم نہ ہوں گے
تم اپنی چادر رفاقتوں کے عظیم ورثہ پہ ڈال رکھنا''[1]

جدیدیت کے حامیوں نے اس مسئلہ کے حل میں مختلف لرائے کے اظہار کیا ہے انکا خیال ہے کہ انسان کا مقدر احساس شکست سے مغلوب ہونا نہیں بلکہ اپنے حالات کا محاسبہ کرنا ان کا سامنا کرنا ان کی سمت کا تعین کرنا اور ان پر غالب آنا ہی انکا مقصد ہونا چاہئے یہی سچی وجودیت ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں فرد کی کشمکش سماجی معنویت سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور ابھرنے والے خلا کو پر کرتی ہے۔

آج جسے ہم جدید ترین دور کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں جہاں ایمان و ایقان کی روشنی پر ظلمت کی فتح ہے قوت حس ختم ہو چکی ہے جسن وفطرت سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے آرائش اور تزئین کاری میں تصنوع شامل ہو چکی ہے ہماری سمتیں ہماری قدریں نہیں بلکہ وہ یکانکی سگنل متعین کرتی ہیں جو ہماری زندگی میں نصب ہو چکے ہیں تباہی کا یہ عمل شدید تر سے شدید ترین ہوتا جا رہا ہے ایسے حالات میں زندگی کے ایک دیرینہ اصول کا سہارا لینا پڑے گا۔ جب کوئی عمل ضرورت سے زیادہ شدید ہو جاتا ہے تو اسکو روکنے کے لئے اس کے اندر ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن آج حالات کی ابتری اور تیز رفتاری نے تمام اصلاحی اور حفاظتی نظام کو

درہم برہم کر رہا ہے اور زندگی بے وست و پا تباہی کے ایک معین راستے سے فنا کی جانب گامزن ہے ہم خوف و بے چارگی کے عالم میں جو تجربات کر رہے ہیں وہ بھی روحانیت سے عاری ہیں اسمیں اخلاص واعتبار اور فطری احساسات کی کمی ہے ہم میں وہ قوت ارادی نہیں رہی جو ہماری اقدار نے ہمیں عطا کی تھی ۔ جدید تہذیب کی اقدار ہمیں وہ قوت عملی نہیں دے سکے گی جو ان مسائل کا حل تلاش کر سکے ۔ ہمیں ان مسائل کا سامنا کرنے کیلیئے جدیدیت کے مدنظر ان قدار کو متعین کرتا ہے جو مشرقی بھی ہیں اور جدید ترین تہذیب کے پیکر میں ڈھل بھی سکتی ہیں ۔

جدیدیت سے جدید ترین کے ہنگامی سفر میں کچھ شعراء اپنی اقدار کے امیں بنے رہے ۔جس میں زبیر رضوی بلراج کومل شمس الرحمٰن فاروقی وحید اختر وزیر آغا شہریار صلاح الدین پرویز وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ زبیر رضوی کا مجموعہ کلام ’پرانی بات ہے‘ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جو اپنے ادوار اور اپنی اقدار کا آئینہ ہے اس مجموعے کلام کے دیباچے میں زبیر رضوی کا خیال ہے ۔

> ’’جب پہلی نظم بن مٹی لکھی تو احساس ہوا کہ ماضی کی جو
> تہذیب فضا‘ عقیدے اور تطہیر کے جو موائض اور حسب
> نسب کی جو پرانی تاریخ مجھے ورثہ میں ملی تھی جو آج بھی
> بدلے ہوئے لباس میں موجود ہے‘‘[۵۴]

اسی عقیدے کو طہارت کے ساتھ اپنے تاریخی ورثہ کو زبیر رضوی نے جدید پیکر عطا کیا ۔

’’پرانی بات ہے
لیکن ہے انہونی سی لگتی ہے
امیر شہر راتوں کو

---

۵۴ ’’دیباچہ‘‘ پرانی بات ہے زبیر رضوی

بدل کر بھیس
گلیوں میں پھرا کرتا
وہ دیواروں پہ لکھی
ہر نئی
تحریر کو
پڑھتا
سرائے میں ہر ایک نو وارد شب سے
سفر کا ماجرا سنتا
گھروں کی چمنیوں کو دیکھ کر
اندازۂ نان جویں کرتا ''[1]

''پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
وہ ایسے پاک طینت تھے
ہمیشہ باوضو رہتے
سلاطیں انکی چوکھٹ چومتے
انکی دعاؤں میں
اثر ایسا تھا
جس کے واسطے جو مانگے
ان کی دعا مقبول ہو جاتی
مسافر اپنا سب، مال و متاع

---

[1] ''امیر شہر کی نیکی'' [2] ''عاقبت اندیش بیٹے'' زبیر رضوی

جس حال میں بھی سونپ کر جاتے
سفر سے لوٹ کر اپنی امانت جوں کی توں پاتے''[۲]

شعراءعصر حاضر میں زبیر رضوی کا رول بہت ہی نمایاں ہے ان کے سامنے ایک طرف رومانیت اور دوسری جانب نئی حقیقت پسندی کی جانب مسلسل بڑھتے رہنے کی جستجو ملتی ہے ان نظموں میں رجز برورپے یا خشت دیوار فسافت شب تک)رویے کی روحانیت، خیال کی سادگی اور جذباتی ردعمل کا فوری اظہار ان کے تجربات کی معنویت پر غالب آتا ہے۔ 'پرانی بات ہے' کے بعد 'دھوپ کا سائبان' انھیں تجربات اور نئی بصیرت کا مظہر ہے 'دوسرا آدمی'، اس نظم میں جدید نظریات کے باوجود وہ اپنی تہذیبی اقدار کو ایک انسان میں تلاش کرتے رہے ان کا یہ جذبہ قابل ستائش ہے ملاحضہ فرمائیں''

''اچانک مر گیا کوئی
چلو یاروپئیں دیوار سے سر پھوڑ کے روئیں
نشہ اترے تو اس کی یاد میں اک مرثیہ لکھیں
پرانے تزکروں میں
اس کے خدوخال کو ڈھونڈیں
کتابوں کے ورق الٹیں
رسالوں اور اخباروں کی پچھلی فائیلیں کھولیں
فراموشی کی ساری گرد جھاڑیں
تلخیاں بھولیں
دماغ ودل کے گوشوں میں چھپی یادیں کریدیں
رنجشیں بھولیں
ہر اک خوبی

---

[۱] ''دوسرا آدمی'' زبیر رضوی ذہن جدید ۱۹ ص۹۲

ہم اسکے نام سے منسوب کر دیں
اور ایسے شخص کا پیکر تراشیں
کل جو اپنے درمیاں
زندہ نہیں تھا''[۱]

عصر حاضر جدید شعراء سے انھیں اقدار کی پاسبانی کا متقاضی ہے جس کے تعین میں انھیں چند نکتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

(۱) انسانی صورت حال اور اسکے مزاج کا مطالعہ مشاہدہ اور محاکمہ
(۲) ماضی سے مستقبل تک درمیان لمحۂ موجودہ میں دلچسپی
(۳) اپنی ذات تک محدود نہ رہ کر ہجوم و ہنگاموں تک رسائی
(۴) شہری زندگی اور گاؤں کی زندگی میں ارتباط

شعراء کی ابھرتی نسل جنھوں نے ان اصولوں کو مدنظر رکھا ہے ان کی تعداد مختصر سہی پر اثر ضرور ہے منیب الرحمٰن ، زبیر رضوی عنبر بہرائچی ، باقر مہدی ،قاضی سلیم جمال اویسی ،عبدالاحد ساز وغیرہ اسی شخصیت کے حامل ہیں عبدالاحد ساز کی تخلیق اب کوئی نوح نہیں آئیگا۔اس ضمن میں شاہکار نظم کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔

''اب کوئی نوح نہیں آئیگا
ایٹمی جنگ کے طوفان میں جو
کشتی امن بنائے
نوع انساں کی بقا کی کوئی تدبیر کرے
نہ محمدؐ نہ ابراہیم نہ موسیٰ نہ مسیح
منہدم قدروں کے اس دور میں جو

اک نئے عہد نئی قدر کی تعمیر کرے
افق عصر پہ اڈے، ہوئے خدشوں کے تئیں
ہم اکیلے ہیں بہت
اب یہاں کرشن کی
بنسی ہے نہ وہ رام کا سوز
نہ وہ گوتم کی بصیرت نہ مہاویر کا تپ
نہ وہ چشتی کے ترانے ہیں نہ نانک کی نگاہ
اب نہ تہذیب نہ آدرش نہ پہچان
کوئی باقی ہے
اور نہ ست یگ کے پلٹ آنے کا امکان
کوئی باقی ہے،
اور جب یوں ہے تو پھر ہے یہ مقام حیرت
اے مرے دیس کے باسی
مرے نادان رفیق!
عرصہ دہر ہی پر موت مسلط ہے تو پھر
اپنے ہی ملک میں ہم
دست و گریباں کیوں ہیں؟
چاک ہے پیرہن وسعت عالم ہی تو پھر
ہم یہاں شکوہ گر تنگئی داماں کیوں ہیں؟
جذبہ خیر سے بھی بڑھ کے
ترے اور مرے بیچ میں آج

مشترک قدر ہے موجود تو بس
آسمانوں سے اترتی ہوئی تنہائی ہے!
لا میرے دوست ذرا ہاتھ بڑھا
اپنی تنہائی کے رشتے کو تعین دے دیں
ختم ہوتی ہوئی اس دنیا میں
ہاتھ میں ہاتھ لئے
جینے کا ساماں نہ سہی
ہاتھ میں ہاتھ لئے
مرنے کا امکاں تو ہے“ [۱]

منہدم ہوتی قدروں کا شکوہ ہر دور کو رہا ہے پر آشوب دور جہاں ہر زاویے سے تہذیب وتمدن اور اقدار کی قدم قدم پر پامالی ہو رہی ہو۔ ایک فنکار کہاں خاموش رہ سکتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ہر وقت آنسو بہانا بھی مناسب نہیں۔ لیکن ایسے حالات میں شعراء کیا کر سکتے ہین جب ہماری قدریں روبہ زوال ہوں انسانی عظمت کی خستہ حالی سے تباہی اور بربادی کی طاقتیں سرفراز ہو رہی ہوں تو حق گوئی، حق پرستی اور انسانی دوستی کے دعوے میں نہ ہی حرارت باقی رہے گی اور نہ ہی ثبات۔

”اس سرزمین شور میں
سوکھے جہاں مہر وفا
مرجھا گئے صدق وصفا
بادہوس جنجال ہے
انسانیت کا کال ہے

---

[۱] ”اب کوئی نوح نہیں آئیگا“ عبدالاحد ساز [۲] ”بنجر زمین“ منیب الرحمٰن شب خون

نخل دعا ہے بے ثمر
ایمان ہے بے بال و پر
دین وعقائد خاک میں
مثل خس و خاشاک میں'' ۲

دور جدید کے شعراء کا اہم مسئلہ جوانوں کا ذہنی اضطراب و کرب' اقداری زوال اور نئی اقدار کی جستجو رہا ہے تہذیبی اقدار کی محافظت اور فرسودہ قدار کو بدلنے کے لئے وہ ہمیشہ تیسری دنیا کا خواب دیکھتا رہا۔ اس خواب کی تعبیر کی تلاش میں وہ معاشرے کی فضا پر چھا گیا۔ فرسودہ اقدار سے بغاوت نئی اور قابل قدروں کا تعین ہی اسکا مدعا بن گیا۔ ایک فرد اپنی تہذیبی اقدار کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن یہ حیثیت شاعر وہ اپنی تمام تر کاوشوں کو اقدار کی حفاظت میں صرف کرتا ہے۔ اور بار بار معاشرے کو اس خطرے کا احساس دلاتا ہے کہ انکی قدریں کن کن صورتوں سے زوال پذیر ہیں۔

''ہرے پیڑوں کو مت کاٹو
مری حسرت مری خواہش مرے
خوابوں کو جینے دو
سنہرے سبز منظر پھیلنے دو مری دھرتی پر
مجھے چھوتے رہیں مہندی کی خوشبو میں
رچے سائے'' ۱

''عقیدے زخموں سے چور پیہم کراہتے ہیں
یقیں کی سانس اکھڑ چلی ہے

---

۱ ''ہرے پیڑوں کو مت کاٹو'' انیس اشفاق شب خون

جمیل خوابوں کے، چہرۂ غمزدہ سے ناسور رس رہا ہے
عزیز قدروں پہ جانکنی کی
گرفت مضبوط ہو گئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے
دلوں میں قوس قزح کی انگڑائیاں جن سے ٹوٹتی تھیں
نہ فرد کا ہی مکان سلامت
نہ اجتماعی وجود ہی زیر سائبان ہے''[۱]

شاعر اپنے بہت سے جذباتی رشتوں کی وجہ سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زندگی ایک بار گراں ہے اور جینا اک مجبوری انسان بطور سزا زندگی گزار رہا ہے لیکن اس خیال کی تردید اکثر شعراء نے کی ہے انھوں نے اپنے عزائم اور جہد مسلسل سے تصورات کو یاس پرستی کے بجائے امید و بیم کے پھولوں سے سجا دیا ہے یہ پھول مرجھانے بھی نہیں پائے کہ ہمارے شعراء نئے ضبط اور حوصلہ کے ساتھ سامنے آئے، باقر مہدی کا شمار ایسے ہی پر عزم اور با حوصلہ شعراء میں کیا جاتا ہے زندگی کی جدوجہد میں مسلسل منہمک رہنا ہی انکا مقصد ہے۔ ان کی دلچسپ نظم 'جینا ہوگا' اس حقیقت کی ترجمان ہے۔

''زخم ایسا ہے کہ بسمل نہیں ہونے پاتے
اشک پلکوں پہ محبت کی قسم کھاتے ہیں
آہیں سینے میں تری یاد کا دم بھرتی ہیں
نظریں تھک جاتی ہیں مایوس تمنا ہو کر
دل ناشاد بہل جاتا ہے ہنگاموں سے''

---

[۱] ''خیموں کا درد'' مظہر امام راد ارص ۱۹۰

یہ اشعار باقر مہدی کی تمناؤں سے متعارف کراتے ہیں وہ دنیا کی ہماہمی میں بھی اپنے غموں کا مداوا تلاش کر لیتے ہیں۔لیکن انکے سینے میں ایک ایسی چنگاری روشن رہتی ہے جو آتشیں احساس کو سرگرم سفر رکھتی ہے اور شہر آرزو کی تکمیل کی تمنا کرتی ہے۔

''کل کی تاریخ محبت سے عبادت ہوگی
اس امید کی خاطر نئی دنیا کے لئے
درد میں ڈوب کے مرمر کے بھی جنیا ہوگا'' [۱]

اس نئی دنیا کی امید میں فنکار ایک پیچیدہ راہ گزر سے گزر کر بھی اس آئینہ خانہ میں پہونچتا ہے جہاں حیران کن جلوہ سامانیاں موجود ہوتی ہیں اور کبھی روشنی اور تاریکی میں الجھتا اس نئی شاہراہ پر پہونچتا ہے۔ جو مختلف منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایسے مقام پر وہ جذباتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس پس و پیش میں وہ غموں کے نئے مراحل سے گزرتا ہوا عزم نو کے ساتھ جادۂ پیما ہوتا ہے بلراج کومل کی نظم ''سفر مدام سفر'' محل نگاہ ہے۔

''نہ جانے ہم کتنی منزلوں سے گزر کے پہنچے ہیں اس جگہ پر
ہمارے چاروں طرف مناظر سہانے رنگوں میں ہنس رہے ہیں
یہ جی میں آتا ہے کاٹ دیں زندگی یہیں پر

....

مگر نہ جانے یہ بات کیا ہے
نگاہ و دل میں سفر کی یادیں

---

[۱] ''جینا ہوگا'' باقر مہدی [۲] ''سفر مدام سفر'' بلراج کومل

صعوبتوں کے نقوش، راہوں کی سختیاں، ان گنت خراشیں
اور اٹھتے قدموں کی آہٹیں یوں بسی ہوئی ہیں
کہ ہر گھڑی یہ گماں ہوتا ہے ہم کسی اور ہی طرف پھر نکلنے والے ہیں
اور دم لے کے چل پڑیں گے!![۲]

اسی عزم وحوصلہ کے مدنظر جب فنکار اپنے سفر کو آغاز تا انجام طے کرتا ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ شعری اقدار کا امین ہے۔ یہ عزم وحوصلہ اور یہ خیالات تعین قدر میں ہمیشہ اسکی نمائندگی کرتے رہیں گے۔ ایسے شاعر کی داخلی اور خارجی کش مکش جو تخلیقی پیکر اختیار کرتی ہے وہ توازن کی جستجو سے پیدا ہوتی ہے اس صورت میں فنکار کے عقائد فلسفہ حیات اور نظریہ فن کے خوبصورت عناصر تحلیل ہو جاتے ہیں۔ وہ دل ودماغ کے مجروح ہونے کا ذکر کرے یا اپنی شکست خوردہ زندگی کا تذکرہ، محبت کی نشاط آمیز کیفیتوں میں کھویا رہے یا امید یاس کے عالم میں بھٹکتا رہے وہ عزم وبغاوت یا جہاد زندگی کا درس دے یا حوصلہ پستی ومحرومی کا شکار رہے ہمیشہ اپنی شخصیت کے اس مرکز کی تلاش میں رہتا ہے جو حسن وصداقت کے مخلص جذبات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

''امید وبیم کی یہ کشمکش ہے راہ حیات
سکوں نواز! ہیں اسکے سوا سہارے کیا''

ایک فنکار کا شعور حقائق کو اپنی گرفت میں لانے اور اپنی تخلیقی قوت سے اسے مرتب کرنے اور منظّم شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ صلاحیت نہ تو فرد کی انفرادیت کو مجروح کرتی ہے اور نہ ہی اسکے تاریخی پہلو کو نظر انداز کرتی ہے نیز کسی ایسی قدر کی نفی بھی نہیں ہوتی جو علم و حکمت کے مختلف ذرائع سے وجود میں آ چکی ہو او جسے انسان ایک تہذیبی قدر سمجھ کر عزیز رکھتا ہو۔ دراصل فنکار کا شعور جتنا اعلیٰ ہوگا اس کی معاشرتی اور آفاقی قدر و منزلت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

آج ہماری شاعری کا سب سے بڑا المیہ تہذیبی قدروں کا زوال ہے مشترک روایات قوانین' اعتقادات اور رسمیں جیسی چیزیں اب رہ نہیں گئیں پر وجہ الفاظ ہمیں کسی خاص سمت میں نہیں لے جا رہے ہیں اس طرح شاعری کا ارتقاء منقطع سا ہو گیا ہے جب اصطلاح نئے الفاظ ڈھالنے کا کام ختم کر دے تو اس زبان کی ترقی بند ہو جاتی ہے نوبت یہاں تک آپہونچی ہے کہ ہم جتنا زیادہ جدیدیت کی طرف بڑھتے ہیں اصل میں ایک دوسرے کو اتنا ہی کم سمجھ رہے ہیں۔

لیکن جدید پسند علمبرداروں نے اس مشبت کو قبول نہیں کیا یہی سبب ہے کہ وہ روایات اور اقتضائے عصر کے درمیان توازن برقرار نہ رکھ سکے عہد نو سے متاثر ہو کر انکے نئے مزاج نے ایک نیا ادب تشکیل کیا جسے ہم حساس ادب کہہ سکتے ہیں اس کے ذریعہ ایک نئے انسان کے حسی تجربوں کا اظہار کیا۔

جہاں صرف اقدار کی وہ صورتیں نظر آئیں جن میں کرب بے چینی تنہائی کے

احساس سے سرشاری کی جھلک ہی ملتی ہے نہ یوں انسانیت کی فلاح ہو سکتی ہے اور نہ ہی مسائل زمانہ کا حل، ہمارے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے ہمارے آدرشوں کے چہرے جھلس گئے۔ یقین واعتماد کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور نظریات وہم وگمان کی تاریکیوں میں بھٹکنے لگے۔

''صداقت کے پرانے ضابطے
حرف غلط ٹھہرے
غلط ٹھہرا
وہ خیر وشر کا افسانہ
بقائے زیست طاقتور کا حق ہے
اور زمانہ استعارہ ہے
کچھاروں میں پڑے مخمور شیروں کا
فضا میں چیختی چیلوں کا..........اور
مقتول بال وپر
سودائے لا حاصل!
صداقت؟
لقمہ تر! ''

اس نظم میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ افسردگی شکست خوردگی اور زوال پسندی کی تصویر ہوتی ہے دراصل یہ تصویر خیر وشر میں تصادم کا نتیجہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب دنیا ملکی معاشرتی اور ثقافتی سطحوں پر اپنی شناخت اور حیثیت کا مقام متعین کر رہی ہے شعراء موضوعات ارضی اور شہری مسائل کا حل تلاش کر رہے ہیں لیکن ہمارے ملک کے بیشتر شعراء اس حقیقت پسند دنیا میں بھی غیر ارضی مسائل سے الجھے ہوئے بے مہار جدیدیت کے علمبردار کا اتباع کر

رہے ہیں جنھوں نے شاعری کو ایک فرضی المیہ سے دو چار کر کے اظہار بیان کا رخ لاسمتیت اور بے معنویت کی طرف موڑ دیا ہے۔

"قدیم کھنڈروں میں
ویرانیوں میں
برجوں میں
بھٹک رہا ہوں
زمانے سے رفتگاں کے لئے
اجاڑ بولتے پتھر
دبی دبی چاپیں
گئے زمانوں کی آہٹ
سنائی پڑتی ہے
قدیم کھنڈروں میں
ویرانیوں میں
برجوں میں
بھٹک رہا ہوں زمانے سے
رفتگاں کے لئے
وہ رفتگاں جو خیالوں میں
کھوئے رہتے تھے
وہ جن کی آنکھ سے
خوابوں کا کوئی رشتہ تھا "[1]

---

[1] قمر ادیب ذہن جدید ۹۹

یہاں شاعر قدیم کھنڈروں کے ذکر سے اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کا احساس دلاتا ہے۔گویا شاعر کو زوال آمادہ قدروں کا المیائی احساس ہے کھنڈر تہذیبی اقدار کی زوال پذیر صورت حال کی علامت ہے جسکے ذریعہ ادیب نے قدروں ک شکست و ریخت کو پیش کیا ہے۔ اور اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ آج تک اپنی تہذیبی سرمائے کو آنکھوں سے لگائے ہوئے ہے۔

''میں بھٹکا ہوں
کتنے سرابوں میں صحراؤں میں
ان کے نقش کف پا ابھی مشتعل ہیں
ابھی دھول نے ان پہ چادر بچھائی نہیں ہے
مجھ سے پیچھے
نئے کاروانوں کی گرد آ رہی ہے
کچھ جیالے جواں
تازہ دم، تیز رو
اور میں
وقت کی رہ گزر کا وہ تنہا مسافر
جو ہر قافلے سے الگ
رہ روؤں سے الگ
اجنبی سمت
یوں چل رہا ہے
کہ اسکے سوا کوئی صورت نہیں ہے''

''یہ کیسا خوف

کینڈلی مار کے بیٹھا ہے
جینے بھی نہیں دیتا
نہ مرنے کی کبھی
سمت عطا کرتا ہے، وہ مجھکو
خدا کو خوب میں اسکی
کرم فرمائیوں سے
جانتا ہوں
اور شیطان کو پہلے
ان کے نت نئے
سرابوں سے
اچھی طرح واقف ہوں ''

خیر وشر کی وضاحت اور اس پر الا انتہا تبصرے شعراء نے اپنی نظریات کی رو سے مختلف طریقے س پیش کیے ہیں۔ جسکا معکس یہی ہوسکتا ہے کہ جب انسان نیکیوں کا خوگر ہوجاتا ہے تو وہ ایک روشن پیکر کا روپ اختیار کر کے سورج کی مانند اپنی قوت روشنی اور تحرک میں پوری طرح گم ہوجاتا ہے اس تخلیق کی مانند۔

''خیر وشر کا یہ تصادم یہ مسلسل تکرار
صرف پتھر میں نہیں ہے یہ شر وخاک میں ہے
نور ہی نور آسماں تا آسماں
میرے اندر ڈوبتے اور چڑھتے ہوئے سورج کئی
جسم میرا روشنی ہی روشنی
پاؤں میرے نور کے پاتال میں
ہاتھ میرے جگمگاتے آسمانوں کو سنبھالے
سر مرا کاندھوں پہ اک سورج

ا ''میں'' شہاب جعفری

کہ نا دیدہ خلاؤں سے پرے ابھرا ہوا
اور زمیں کے روز شب سے چھوٹ کر
آ گہی کی تیز رو کرنوں پہ اڑتا ہوا۔
چار جانب اک سہانی تیرگی کی کھوج میں نکلا ہوا'' [۱]

شہاب جعفری کی اس نظم کے مطلع سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر محض واقعاتی سطح سے ہی وابستہ ہو کر ماضی کی اقدار سے وابستہ نظر آتا ہے یہ نظم اس فرد کی کہانی ہے جو کبھی تازہ سورج کے روپ میں تہذیب امن اور روشنی کا مظہر بن کر چاہ شب سے طلوع ہوا تھا۔ جو ایک طویل مسافت کے بعد تھک ہار کر تخریب فنا اور خودکشی کی جانب مائل ہے۔

''نہ یہ فنا ہے، نہ یہ بقا ہے
میان بود و عدم یہ کیسا طویل وقفہ ہے
جو نوشتہ ہماری قسمت کا بن گیا ہے
کنار دریا کبھی یہ ہستی تھی
لیکن اب نیستی اور ہستی کے درمیان ایک مقام برزخ ہے
ایسا برزخ کہ جسمیں صدیوں سے کاخ و کو، بام و در، مسلسل
شکستگی، خستگی، خرابی میں خیرہ سر ہیں'' [۱]

''خزاں رسیدہ شاخ گرتے پتوں سے کہہ رہی تھی
مری رگوں کے لہو میں حدت رہی جہاں تک
میں تم کو سینے کے ساتھ چمٹائے شادماں تھی
یہ اب تمہارے سڑے جنازوں پہ رونے والا کوئی نہ ہو گا
لہو کی حدت گزشتنی ہے

---

[۱] ''حنذر'' مختار صدیقی نئی نظم کا سفر ص ۱۰۴

ہراک حقیقت گزشتنی ہے
مگر وہ پتے یہ کہہ رہے تھے
نئی رتیں پات بھی پتے لے لے آئیں گی صرف ہم نہ ہونگے
کہ دائمی زندگی ہے بس گذشتنی ہیں۔''

ایک تخلیقی فنکار اور خاص کر شاعر کیلیئے فنی نکتہ نظر سے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آواز میں ان سماجی عناصر کی آواز کس طرح ملا دے جن کی نمائندگی اسکے خیالالت کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسکو شاعری کی رموز وعلامات سے کام لینا پڑتا ہے۔ تا کہ وہ اپنے احساسات اور تصورات کو صداقت کے ساتھ پیش کر سکے اس کوشش میں جب وہ کامیاب ہوجاتا ہے تو اسکے اندر ایک آفاق گم ہوجاتا ہے جب وہ مٹی ہوئی اقدار زخم مفلسی، امیدوں کے خواب' آرزؤں کا طلسم نا آسودگی کے کرب اور مایوسی کے اندھیرے کا ذکر اپنے اشعار میں کرتا ہے تو اس آواز میں اس پورے معاشرے کی آوازیں شامل ہوتی ہیں۔ جو ان علامات سے دوچار ہے آج کا شاعر اپنے تجربوں کی جزباتی فضا میں پورے نظام کائنات سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے۔

''میں جو لفظ بھی بولتا ہوں
میں جو کچھ بھی پہچانتا ہوں
مرے جسم کو ڈھانپنے والے کپڑے
مجھے زندہ رکھنے میں
مری مدد کرنے والی غذائیں' دوائیں
یہ مذہب یہ تہذیب سب کچھ
مجھے دوسروں سے ملا ہے۔ انھیں بھی کسی دوسرے سے ملا ہے
جنھیں اپنی پہچان کا
سر پھرا زعم ہے میں انھیں
دست بستہ بلاتا ہوں' آئیں

ا ''پہچان''، فضل تابش جدید نظم نمبر ص ۱۵۹

مجھے ریشہ ریشہ ادھیڑیں
بتائیں
مجھے صرف اتنا بتائیں
کیا وہ الگ ہیں؟
کیا میں الگ ہوں؟'' [۱]

''تہذیب گئی علم لٹا فن ہوا زخمی
ہوگا ابھی انساں کا یہاں کتنا زیاں اور''

جدید شعراء میں کچھ اہم نام ایسے ہیں جو اپنی اقدار کی زوال پذیری پر نوحہ کناں ہیں وحید اختر، باقر مہدی، مظہر امام زبیر رضوی .... کی فکری توجہ کا بنیادی مرکز تغیر پذیر اور زوال پذیر قدریں ہیں ۱۹۷۰ء کے شعراء میں خترالایمان پہلے شاعر ہیں جنھوں نے معاشرتی زندگی کو اقدار کے حوالے سے سمجھنے اور اسکی معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ان سے قبل ایسی تخلیقات کم ہی نظر آتی ہیں جو اقدار سے موضوع ہوں مابعد جدید تخلیقات میں معاشرتی زندگی کی جو اقداری تبدیلیاں واقع ہوئیں ان کے اہم موضوع اقتصادی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کی صورت میں نظم آرا ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش، قدیم اور جدید کی پس و پیش، معصومیت اور بلوغیت کا کاروبار ذہن کا تصادم ان قدار کو یہ اسطرح پیش کرتے ہیں کہ فنکار کے ذہنی کرب کا انداز بخوبی کیا جا سکتا ہے، وحید اختر کی یہ نظم 'کھنڈر'' آسیب' اور 'پھول' ایک ایسے شخص کے ذہنی انتشار کی غماز ہے جو اقداری زوال کا مجبور تماشائی ہے۔

''ہم کو ماضی کے ورثے میں کہنہ قبریں' گرتے خیمے اور آسیب زدہ کھنڈروں کے ڈھیر ملے ہیں۔
وہ روشن شب تاب دیئے جن سے ماضی کو نور ملا تھا

اس آسیب زدہ ماحول میں یوں چلتے ہیں
جیسے اک پر ہول بیاباں کے تیرہ سناٹے میں
کچھ بھوتوں نے
رہ گم کردہ سیاحوں کو بھٹکانے کی خاطر آگ جلائی ہو
اب یہ اجالے صرف دھواں ہیں
اور آسیب زدہ کھنڈروں کی چھت کے چٹخے شہتیروں کے شور میں کوئی ہنستا ہے
جھڑتا چونا گرتی مٹی نیم معلق دیوار و در
چپکے چپکے روتے ہیں" [۱]

ماضی کا یہ ورثہ جو زنگ آلودہ ہو چکا وحید اختر کے ان سارے تجربات کا مترادف ہے جن کا تعلق انفرادی اور معاشرتی تجربوں سے ہے ان کے نزدیک سماجی اور تہذیبی اقدار کے تعین تبدیلی یا اسکے برخلاف زوال کا محرک خود انسان ہوتا ہے اور اسکی ساری زندگی اس مدوجزر سے متاثر ہوتی ہے۔ زبیر رضوی کی تخلیق پرانی بات ہے۔ مظہر امام کی تخلیق بند ہوتا ہوا بازار کی زیادہ تر نظمیں جیسے شعاع فردا کے راز دانوں! اشتراک، اکھڑتے خیموں کا درد، راستے کی تلاش، دھوپ میں ایک مشورہ، وغیرہ اپنی اقداری نوعیت کا اظہار بڑی خوبی سے کرتی ہے۔

"بیٹھ جاؤ یہیں
اس خرابے میں تسکیں کے ساماں ڈھونڈیں
تمھیں آج میں اپنے ماضی کی وہ داستانیں سناؤں
جنھیں دوسروں سے ابھی تک نہیں کہہ سکا ہوں:
جگمگاتے تھے میری جبین مقدس پہ
آدرش کے چاند تارے

---

[۱] "کھنڈر"، "آسیب اور پھول" وحید اختر

آنے والے زمانے کے سورج
شہر کے جاگتے شور میں
میں نے اک اک آواز دی
میں نے اک اک سے پوچھا کہ تم مجھ کو پہچانتے ہو؟
ایک طنز آفریں خامشی میرے ہمراہ چلنے لگی

''حکایت ہے
وہ برسوں بعد
جب اپنے گھروں کو لوٹ کر آئے
انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی
ان کے بیٹوں نے
انہیں بالکل نہ پہچانا
گھروں کے آنگنوں کی باہمی تقسیم کر لی تھی
مکانوں کے نئے نقشے بنائے تھے
اور ان کی ساری چیزیں وہ
غریبوں اور محتاجوں میں جا کر
بانٹ آئے تھے!''[۱]

اس نظم سے تہذیبی اقدار کے زوال کی راہیں متعین کی جاسکتی ہیں جسے مذہبی عقائد سے انحراف، یقین محکم میں تذبذب او بے ثباتی، بزرگوں کی عظمت وتوقیر سے روگردانی، رشتوں میں صداقت اور خلوص کا فقدان وغیرہ ایسی راہیں ہیں جو زندگی کو لامعنی اور بے سمتی ہی نہیں عطا کرتی ہیں بلکہ فرد اور معاشرے کے باہمی رشتے کو منقطع کر کے ان کے درمیانی فاصلے

---

[۱] ''عاقبت اندیش بیٹے'' زبیر رضوی پرانی بات ہے ص ۴۷

طول وطویل کرتی ہیں انھیں بدلتے اور مٹتے ہوئے اقداری سرمایہ کا حال قاضی سلیم نے یون بیان کیا۔

''ہزاروں کائناتیں ٹوٹتی ،بنتی ہیں ہر لحظہ
تناور پیڑ گرتے ہیں
چٹانیں ریزہ ریزہ ہو کے نس نس میں کھٹکتی ہیں
دریچے پے بہ پے برسات کے حملوں سے اندھے ہیں
فضا گونگی ہے' بہری ہے
چلو یہ زندگی اور موت دونوں آج سے میرے نہیں ہیں
مری آنکھوں کی بینائی
زباں کی تاب گویائی
سماعت لمس' سب کچھ آج سے میرے نہیں ہیں
چلو میں بھی تماشائی ہوں خود اپنے جہنم کا
مری دنیا تماشا ہے'' [۱]

انسان جو اپنے گرد و پیش غیر آہنگی حالات پا کر خوف و ہیجان کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ پر آشوب حالات سے اسکی زندگی تہو بالا ہوتی نظر آتی ہے جسکی زد میں آ کر اسکے تخیل پسندانہ پیکر چور چور ہو چکے ہیں وقت کی سفا کی اسے ان حالات سے آنکھیں چرانے پر مجبور کرتی ہے اس نے بردباری اور ثابت قدمی جیسی صفات کو گنوا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جدید سماجی اور معاشی نظام کے تصادم سے ہراساں ہے آج کا شاعر زندگی کی حقیقتوں کے ادراک و اظہار میں جس طرح غیر رومانی انداز اختیار کرتا جا رہا ہے وہ کلاسیکی ضابطوں کو بڑی حد تک توڑ چکا ہے۔ نظم جدید کا کرب آج زندگی کا زائیدہ ہے۔ جس میں علم وفن کی آگہی اور طلسم

---

[۱] ''مکتی'' قاضی سلیم نئی نظم کا سفر ص ۱۷۸

واسرار کی تیکھی مہریں ہیں جوایک جدید شاعر کی محرک ذات کے اندر تڑپتی رہتی ہیں جسکا ظہور اسکی نظموں کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن جدید شاعری صرف انفرادی خودفریبیوں پر ہی مبنی نہیں بلکہ وہ ذاتی صفات کے حقائق پر بھی غور خوص کرتی ہے جوشاید ابھی نشرونما کی منتظر ہے۔

''مدتیں گزریں مرے دل کو ہوئے ویرانہ
آندھیاں بھی نہیں آتیں
کہ اڑے ریت مٹے نقش سراب
اور اک درد کا چشمہ
مندمل زخموں سے پھوٹے نئی خنکی لیکر
پیاس جاگ اٹھے سکوت دل مضطر ٹوٹے
تاکہ میں دیکھ سکوں
اپنی بے خواب آنکھوں سے وہ منظر اک دن
ریت کے تودے فضاؤں میں اڑے جاتے ہیں
اورخوش ہو کے کہوں
زندگی ریت سہی'' ''درد کا چشمہ بھی تو ہے'' [۱]

---

[۱] ''ریت اور درد'' باقر مہدی کالے کاغذ کی نظمیں

باب چہارم

دنیا کے تمام مذاہب نے اپنے نظام فکر وعمل کا مرکز انسان کو بنایا ہے انسان ہی وہ محور ہے جس کے گرد دنیا کی تمام تہذیبیں گردش کرتی ہیں انسان کی عظمت انسان کا احترام انسان سے محبت کے حقوق اور انسان کے مقام ومرتبہ پر دنیا کے تمام مذاہب کے مفکروں فلسفیوں بزرگوں اور ریشیوں نے روشنی ڈالی ہے اور سب انسانوں کے درمیان مضبوط رشتوں کو استوار کرنے کی سعی کی ہے۔ ترقی پسند ملک یورپ میں بھی مختلف ادوار میں انسانی دوستی کی تعلیم ملتی ہے اور مصنفین کی ایسی جماعت ظہور میں آتی ہے جو عیسائت کے جبر وقہر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے اور انسانی دوستی کا نعرہ بلند کرتی ہے۔ جیسا کہ مسٹر فورٹون ڈکشنری آف فلاسفی میں اسکی تشریح یوں کرتے ہیں: -

> " ہیومانزم خیالات کا وہ نظام ہے جو آدمی کی عظمت اور اس کے حقوق کے احترام پر استوار ہے انسانی شخصیت کی قدر و قیمت اسکی خوشحالی اور اس کی ہمہ جہت ارتقاء اور اسکی سماجی زندگی کے لئے مناسب وموضوع احوال کے تشکیل اسکا مطمع نظر ہے " ۵۵

مصنف کے خیال کے مطابق احترام انسانیت کا تصور دراصل مذہبی تعصب اور دوسروں کے علوم کے بارے میں عدم احترام وغیر رواداری کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔

DICTIONARY OF PHELOSPHY PG.NO.78۵۵

یورپ کے فلسفہ میں رواداری اور احترام انسانیت کا جدید سرچشمہ اگر تلاش کیا جائے تو یونان کے قدیم فلسفی پروٹیگرس Protagaras تک بات جاپہو نچے گی۔ جو حضرت عیسیٰؑ سے ۴۸۰ سال قبل پیدا ہوا تھا وہ انسان کو کائنات کی جملہ موجودات کا سبب اور ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس کے مشہور مقولہ کو ہیو مانزم کے علمبر دار نے مشعل راہ بنایا۔

''انسان جملہ موجودات اور اشیاء کائنات کا ہمالہ ہے''

اس مقولہ کو یورپ نے نشاۃ ثانیہ میں حیات نو عطا کی اسی فکر سے نظریہ علمیت کا آغاز ہوا۔ اس نظریہ کی رو سے کسی شے کا معیارِ حقیقی صرف یہ ہے کہ اسکا تعلق انسانی اغراض سے ہو مفادات سے ہو مغرب نے بھی انسان کو کائنات کی وجہ بنا بنایا ایسے علوم ایسی قدار اور ایسے عقائد کے خلاف اس نے ہیو مانزم کے پس پردہ اعلان بغاوت کیا۔ جو اسکے نزیک غیر انسانی تھے۔ اس نے منطق وفسلفہ کے غیر انسانی عمل کو مسترد کر دیا۔ اور اسی حقیقت کو لائق احترام بتایا جو انسان کے لئے مفید تھے ہیو مانزم کے داعیوں نے رسمی اور مذہبی اقدار کی بنیاد ہلا دیں۔ انھوں نے قرون اولیٰ کے ان تمام مظالم کا بھرپور انتقام لینا چاہا جو مذہب کے نام پر کئے گئے تھے مسز اوٹن کے ان خیالات میں مغربی ذہن بخوبی نظر آتا ہے

''تعصب وناروداری' خوف کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے
جسے انسان نے اپنے لئے جنم دیا، خواہ وہ قادر مطلق
کا ہو یا اشتراکیت کا'.............................صدیوں
کی ناروداری نے انسان کے تجربات کی رنگارنگی کو محدود
بنا کر رکھ دیا ہے۔ جب تک انسان اپنا مالک آپ نہیں بنتا
اور اپنے ماحول پر حاوی نہیں ہوتا۔ کیا وہ رواداری کی
راحت اور اس کے لذیذ پھلوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے؟'' ۵۶

---

۵۶ HUMAN & SOCIAL PATHOLOGY BY BARBARA WOOTTEN PG.350

ان الفاظ سے یہ صاف واضح ہے کہ مفکروں نے بھی احترام انسانیت کو ہی ہیومانزم کی سب سے بڑی خوبی بتائی ہے بیسویں صدی کے وسط مغرب میں انسانیت اور اسانی دوستی کا زبردست چرچا رہا یورپ کی پانچ صدیوں میں انسانیت کا دم بھرنے کا ہمیں مختلف رنگ وروپ میں ذکر ملتا ہے بیشتر مفکرین وفلسفیوں نے احترام انسانیت کو اپنے خیالات کا مرکز بنایا۔ اہل فکر کی ایک بڑی تعداد یورپ میں جغرافیائی حدود' رنگ ونسل اور فرقہ وارانہ ناہمواریوں کو ختم کر کے انسانی کنبہ کو یکجا کرنے کی پرزور حمایت کرتی رہی ہے ایسے مفکرین کا نظریہ مذہب معاندانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے صالح قسم کی جدیدیت ماضی کی صحت مندرقدروں' احترام انسانیت شرف انسانیت سے ہمیشہ اپنا رشتہ برقرار رکھتی ہے۔ وہ اس خیال کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔ وضاحت انھیں کے الفاظ میں پیش ہے:-

''صالح قسم کی جدیدیت وہ ہے جو وقت ماحول کے فطری تقاضوں اور ادیب کے اپنے احساس اور تجربہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جو شاعری اپنے ماضی سے بالکل کٹ کر جدید ہوئی وہ صحیح معنوں میں جدید بھی نہ ہوگی اس میں انوکھا پن اور چونکا دینے کا انداز تو ہوگا جو وقتی طور پر ہماری توجہ کو مبذول تو کرتا ہے لیکن اس کا رنگ بہت جلد پھیکا پڑ جائیگا'' ۵۷؎

یہی وجہ ہے کہ جدید شعراء میں فطرت سے ہم آہنگی کا میلان کافی حد تک نظر آتا ہے وہ دور جدید کے غیر انسانی اور ششدرانہ طرز عمل سے فضا میں بے حد آلودگی محسوس کرتے ہیں چنانچہ انکی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے تہذیب اقدار سے وہ ربط و تعلق برقرار رکھا

۵۷؎ ''کچھ نئی شاعری کے بارے میں'' ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ماہنامہ کتاب گھر لکھنؤ۔
۵۸؎ ''جدیدیت'' ڈاکٹر شمیم حنفی

جائے جس کو جدیدیت کے خمار میں انسان یکسر فراموش کر چکا ہے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کے الفاظ میں :-

'' ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ معصومیت سے ایک ربط استوار
کیا جائے۔ جسے انسان اپنی ذہنی اور تہذیبی ارتقاء کی جدوجہد اور
کامرانیوں کے نشے میں کھو بیٹھا ہے۔'' ۵۸

جدید شعراء نے انسانی وجود اسکی شخصیت اور اسکی عظمت سے گہرا ربط استدار کیا۔ اس نے ہر انسانی مسئلہ کو ذاتی زاویہ سے دیکھا اور تجس کا چراغ اپنے دل میں ہمیشہ روشن رکھا۔ انھوں نے مغربی تہذیب جسکو جدیدیت کا جامعہ پہنا کر نہایت دلکش انداز میں اپنایا گیا تھا اسکے تصنوع و تکلف کے طلسم کو چور چور کر دیا۔ انسانی زندگی کیا اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں پر وار کرنے والی اس تہذیب کی سخت مخالفت و احتجاج بھی کیا، شرف انسانیت اور احترام انسانیت کے نغمے بکھیر کر ہمارے دلوں کو اک نئی حرارت اور نغمگی بخشی مگر انسانیت کی منزل مقصود کا تعین نہ کر سکے اور اسکو مزید تاریکیوں میں پہونچا دیا۔ ان میں سے بعض نے تو انسانی تہذیب کے روشن نقوش مٹانے کی کوشش کی اور ان صحائف پر بھی وار کیا جنھوں نے انسانی شرف کو دوبالا کیا تھا۔ سلیم الرحمٰن نے اپنی ایک نظم 'کتبہ' میں لکھا۔

''معجزوں اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری
سچائیاں مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پہ مٹی ہوئی تختیاں ہیں
مجھے اپنے اجداد کی ہڈیوں میں کبھی زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہے'' [۱]

جدید شعراء کے بیان شرف انسانیت کے بہت روشن اور تابناک خطوط ملتے ہیں۔ مادہ پرستی کے اس دور میں بھی آج کا شاعر فلاح انسانیت اور احترام انسانیت کے گیت

---

۱ ''کتبہ'' سلیم الرحمٰن

گائے جارہا ہے اور فرد کی عظمت و بالاتری کے سامنے ساری کائنات کو زیر کر رہا ہے۔ جدیدیت نے نام ونمود عیش پرستی اور ہوس ولالچ سے بھرپور شہری تمدن پر زبردست تنقید کی ۔ یہ دراصل احترام انسانیت اور انسانی دوستی کا بیکراں ولولہ تھا جسمیں انسان پر ہونے والے مظالم اور اسکی فطرت کومسخ کرنے والی تمام کوششوں پر اپنی برہمی کا اظہار بہت ہی دلیرانہ طور پر کیا۔ ڈاکٹر وحید اختر کا خیال ہے کہ جدید شاعر اپنی شاعری کی بنیاد وجودیت کے فلسفے پر رکھتا ہے وہ شرف انسانیت اور انسان کی فضلیت پر زور دیتا ہے جو ساری دنیا کے اانسانوں کو فکری طور پر متحد کر سکتی ہے۔ وہ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں ۔

''وجودیت نے دوسری جنگ کے بعد انسان کو سمجھنے کی کوشش
کی جو موجودہ بحران میں اپنے آپ ڈھونڈ نا سمجھنا اور باقی
رکھنا چاہتا ہے'' [۵۹]

انسان کو سمجھنے کو لئے اسکی اقداری سطح کا معیار دیکھنا ضروری ہے لیکن ادبی نظریے سے ادب میں ادبی اقدار کو ہی مذہبی سیاسی اور اخلاقی اقدار پر ہمیشہ فوقیت دی گئی ہے۔ یہ اقدار انسان کو خیر وصداقت کے ساتھ ساتھ روحانی اور داخلی سکون عطا کرتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اسی سکون کی تلاش میں اپنی نظم 'سایہ دیوار میں' گھر اور آنگن کے آرزومند ہیں ۔

''مجھ کو دیدے، وہی میری اپنی گلی
چھوٹا موٹا مگر خوبصورت سا گھر
گھر کے آنگن میں خوشبو سی پھیلی ہوئی
منھ دھلاتی سویرے کے پہلی کرن'' [۱]

دور حاضر کا شاعر موجود تمدن کی پیدا کردہ بے حسی فضا کی آلودگی خودغرضی

---

[۵۹] ''فلسفہ اور ادبی تنقید'' ڈاکٹر وحید اختر ص ۱۷۷ [۱] ''سایہ دیوار'' خلیل الرحمٰن

اور احساس بیگانگی پر بے حد نالاں ہے، پرانی اقدار کے بارے میں جدیدیت کے رویہ نے شرف انسانیت کے عظیم آدرشوں کو بے بہرہ بنا دیا ہے بے چہرہ کر دیا ہے۔ داوازم نے انھیں یہ سبق دیا کہ

''تم میں جو کچھ ہے اسے تباہ کرتے رہو پھر تم بہت سے
بھیدوں کو سمجھنے کے اہل ہو سکو گے''

اسی جنون نے جدیدیت کے بعض علمبرداروں کو ژولیدہ ذہن اور لاشیت تک پہونچا دیا۔ انھوں نے اپنی راہ تعقل اور اخلاق سے ہٹ کر بنائی جو عظمت آدم کے بجائے زوال آدم کا سبب بنی اس زوال پذیری پر تاریخ کے ابتدائی دور سے رشی منی صوفیائے کرام مفکر اور شعراء نے آنسو ہی نہیں بہائے بلکہ انسان کی روحانی بلندی اور اخلاقی اصلاح کے لئے بھرپور جدوجہد کی اور مذہبی اخلاقی اور تہذیبی تعلیمات وعقائد کی روشنی میں انسان کے قلبی آئینہ کو تابناک بنانے کیلئے کوشاں رہے انھوں نے انسان کے جسم سے زیادہ اسکی روح پر اور مادی ضرورتوں سے زیادہ اسکی ذہنی فلاح و بہبود کو اپنا محور بنایا۔ اور انسانی حقوق کو احترام اور انسان کی آزادئ خیال کو پوری طور سے ملحوظ رکھا۔ ڈاکٹر فاطمہ تنویر نے اسکی وضاحت یوں کی ہے۔

''تصوف کی عمارت دو ستون پر استوار تھی اول صفائے قلب۔
دوم انسان دوستی اور حق خدمت خلق کے راستے معرفت حق کا حصول'' ۶۰

گذشتہ شعراء میں میر تقی میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، چکبستؔ اور اقبالؔ نے بھی احترام انسانیت کے ترانے گائے اور عظمت آدم کا درس دیا۔ اپنے دور میں حالیؔ بہت بڑے انسانیت کے حامی و پیامی کی حیثیت سے ابھرے۔ بیسویں صدی میں اقبالؔ نے مشرق کے عام انسانوں

---

۶۰ ''اردو شاعری اور انسان دوستی'' ڈاکٹر فاطمہ تنویر ص ۲۷۰

کوخوداعتمادی،عزت نفس اورآدمیت کا درس دیا۔انھوں نےعظمت آدم کی شناخت یوں کردی۔

''ہاتھ ہےاللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب کارآفریں کارکشا کارساز''۔

اس طرح ہزاروں بزرگ جنھوں نےعظمت آدم اوراحترام انسانیت کی بالاطرفی کی،جدیدادب میں بھی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔
سردارجعفری نے ساری انسانیت کوایک کنبہ اورتمام انسانوں کوبھائی بھائی کہا ہے۔

''زندگی ایک زمیں ایک ہےانساں بھی ایک
پیکر کا بحر بھی جذبات کا طوفان بھی ایک''

بحیثیت مجموعی شعراء کی ان کاوشون نے انسان دوستی اوراحترام انسانیت کی فکرکومزیدتقویت عطا کی اورمشرقی تہذیب واخلاقی روایات کواحترام کے ساتھ دورحاضر کے حقائق کو سمجھنے اور مستقبل کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک حقیقت پسندانہ عظمت اور انسانیت کی راہ اختیارکرنے کی تلقین کی۔
جدید شاعری میں بھی شاعری کا سب سےاہم موضوع انسان ہی رہا انسان کی افضلیت اسکی قدومنزلت اوراسکی باہمی روابط میں حسن خیز پہلوؤں کی تلاش کو بیشتر شعراءاور فنکاروں نے اپنا خاص موضوع متعین کیا۔ یہ ایک واحد حقیقت ہے کہ شاعری کے آغاز سے دور جدیداور مابعدجدیدیت تک اردوشاعری کا سب سےزیادہ مغلوب توانااور ہمہ گیر رجحان انسانی دوستی کا رجحان ہی ہے جدید شعراء کے یہاں انسانیت کا تخلیقی عمل کہاں تک کارفرما ہے سجاد ظہیر

کی دو نظمیں بطور مثال پیش ہیں۔

''کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے
کہ دوستی کے سب، روپہلے رشتے
پیار کے سارے سنہرے بندھن
سوکھی ٹہنیوں کی طرح
چٹخ کر ٹوٹ نہ جائیں
آنکھیں کھلیں، بند ہوں، دیکھیں
لیکن باتیں کرنا چھوڑ دیں
ہاتھ کام کریں،
....
گر پھول جیسے بچوں کے
ڈگمگاتے چھوٹے چھوٹے پیروں کو
سہارا دینا بھول جائیں'' [۱]

''اے کاش دلوں میں روحوں میں
ایسی ایک چنچل باڑھ آئے
بیکار ڈروں کے ڈھیروں پر
ہمت کی لہریں بکھرا دے،
خود غرضی کے صندوقوں کو
اک جھٹکا دے کر الٹا دے

---

[۱] ''کبھی کبھی'' سجاد ظہیر

پھاڑ کے لالچ کی پوٹوں کو
جالوں کے جہل وشقاوت کے
اور ظلم کی گندی مکڑی کو
چکنی کالکھ کو تعصب کی،
نابود کرے، ناپید کرے
یوں نم کردے دل کی کھیتی
امیدیں سب سے لہرا اٹھیں
گلنار شگوفے الفت کے
سوکھی جانوں سے، پھوٹ پڑیں!
اے کاش دلوں میں روحوں میں
ایسی اک چنچل باڑھ آئے'' [۱]

''میں اپنا فرض آج بھی نہ جانوں
کھڑی ہے سچائی میرے آگے، میں اب اسے کسطرح نہ مانوں؟
کہ ساری انسانیت کے سکھ میں بڑا سکھ ہے
یہ زندگی کا اسیم دکھ، میرا اپنا دکھ ہے
یہاں ضرورت ہے روشنی کی
وفا کی ایثار ہمدردی کی
میں اس جگہ تو ضرور گاؤں گا دائمی سرخوشی کا نغمہ
امید کا، زندگی کا نغمہ
بڑے زمانے سے آدمی اک ایسا دیپک ہے

---

[۱] ''باڑھ'' سجاد ظہیر آزادی کے بعد اردو نظم [۲] ''رات گزر رہی ہے'' تاجور سامری آزادی کے بعد نظم ص ۹۰

جس پہ لو مسکرا نہ پائی
کراہوں، آہوں نے مسخ کر دی ہے اس کے جیون کی خوشنمائی

....

....

یہ آدمیت کا نقطہ گہنا گیا! تو پر لے مچے گی ہر سو
اجاڑ دھرتی 'اداس ویرانیوں کو دیکھا کرے گی ہر سو'' ۲
انسانی رشتے کا تعین انسانیت کے فرائض کا احساس ہمارے شعراء کو خوب
ہے دراصل شاعر احساس اور جذبات کی زبان کو ہی مخالفت کے وار کو رد کرنے یا موافقات سے
مقابلہ کرنے کیلیے بروئے کار لاتا ہے۔ سردار جعفری کی یہ نظم میرے اس خیال کی لفظ بہ لفظ تائید
کرتی ہے۔ ملاحظ فرمائیں۔

''چمن کے پھولوں چمن میں اک آگ سی لگا دو
لچکتی شاخوں! فضا میں زنجیر بن کے پھیلو
زمیں کی دھاتو ہوا میں جوالا مکھی اچھالو
ملوں کے پہیو تفاوتوں کے ترانے گاؤ
کہاں ہوا ہے نیکیوں کی فوجو
بدی کے اونچے محل گرا دو
صداقتوں آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو
حیات کی تیز تند موجو! فنا کی خاشاک کو بہا دو
سحر کی کرنوں اندھیری راتوں کے سر پہ برسو،
عوام کے دشمنوں کا نام و نشاں مٹا دو'' ۱

جعفری صاحب نے انسانیت کو زندہ رکھنے والی ان تمام صداقتوں کو آواز دی

---

۱ علی سردار جعفری

ہے جو انسان کو تہذیبی اور انفرادی طرز عمل کی جانب گامزن کرتے ہیں۔

انسان کے درد کو اپنے سینے میں چھپائے رکھنا اور اسی میں پگھلتے رہنا مشرقی تہذیب کی ایک قابل قدر روایت رہی ہے جسکا احترام ہر دور کے شعراء کرتے رہے ہیں یہاور بات ہے کہ جدید شعراء انسان کی حیثیت اور اسکے مقدارات کو ایک نئی سطح پر پرکھنے کی جستجو میں ہیں یہ اب انکی تخلیقات ان کے مادی اور طبعاتی رشتوں سے آگے اسکے وجود کی مابعد الطبعیاتی جہات سے بھی مربوط کر رہی ہیں۔

جدیدیت سے وابستہ شاعری کا حال بھی تنقید کی طرح ہے جو متضاد فکر وفہم کے امتزاج سے عبارت ہے یہاں کوئی اصولی نظریۂ تنقید ایسا ہے ہی نہیں جس کی بنا پر کوئی مجموعی نقشہ کوئی ترتیب وتزئن کے ساتھ کسی قدیم فریم میں مقید کیا جا سکے یہی وجہ ہے جس کے ذہن ودل میں جو آیا زیب قرطاس کیا خودقاری کا معیار بھی اب نقاروں کے قائم کردہ معیاروں سے کہیں بہتر ہے۔ اگر کہیں منفی اقدار کی قدر کی جاتی ہے تو کہیں مذہبی رجحانات بھی شدت سے پائے جاتے ہیں اور مذہبی افکار بھی سراہے جاتے ہیں۔

کچھ ایسے شعراء جو مذہبی رجحانات اور مذہبی احساس سے آج بھی سرشار ہیں مذہب اور خدا سے وابستگی ان کی شاعری میں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے یہ رشتہ شاعروں کے معاملے میں انفرادی بھی ہوسکتا ہے۔ عمیق حنفی نے 'صلصلۃ الجرس' میں مذہبی میلانات اور اسکی اہمیت پر واضح طور پر اپنے خیالات پیش کئے۔

""مشکل ہے نیک وبد کی تمیز، گڈ مڈ ہوئے ہیں ایسے حدود
نیلے سمندری پانی پہ چھایا ہوا ہے جیسے چرخ کبود
آب رواں پر حبل حباب تہذیب نو کی نام ونمود
تہذیب نو ہے ایسا چراغ جس کو ملا ہے فانوس
چھوتا ہے علم مریخ و ماہ لیکن ہے دراصل شہود
ایماں نہ ہو تو مشق حباب تخلیق عالم ہست وبود

---

۱ 'صلصلۃ الجرس''عمیق حنفی

مدت کے بعد، پیشانیوں میں تڑپے سجود
ہو گئے تھے ہم تم سے دور، اور کتنی دور تم پر درود ٹوٹے ہوئے سارے قیود
لب پر تمہارا آتا ہے نام
خیر الانام
تم پر درود
تم پر صلوٰۃ تم پر سلام [۱]

''ہاں وہ مسلمان تھے
ہم جیسے انسان تھے
لیکن ان کے سینوں میں قرآن تھا
اور ہاتھوں میں تلوار

....

وے آسماں سے نہیں اترے تھے
لیکن آسمانی دھوپ لیکر آئے تھے
وے مساوات مساوات چلاتے تھے
نیا انقلاب لائے تھے'' [۲]

زمانہ لاکھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا پرچم لہراتا رہے مذہب نے سیکڑوں برس پہلے جو پرچم کشائی کی وہ آج بھی بڑی شان سے لہرا رہا ہے اور ہمیں دعوت عمل دے رہا ہے لیکن اقتصادی سیاسی اور سائنسی ترقیات کی کشمکش میں اتنا الجھ چکا ہے کہ مذہب کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں رہا۔

''مسجد کا گنبد سوتا ہے

---

۲ ''ندا فاضلی''

مندر کی گھنٹی خاموش
جزدانوں میں لپٹے
سارے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے''[۲]

زندگی نے ہمارے ذہن و دل کو اسطرح مفلوج کر رکھا ہے کہ ان کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہیں۔ پیار و محبت خلوص و ایثار جیسے جذبات ارزاں ہو چکے۔ مظہر مہدی نے اپنی نظم 'ارض بے پیغمبر' میں نہایت لطیف اور سائستہ لہجے میں اس ارزانی کی سمت اشارہ کیا ہے۔

''یہ دھرتی بھی
دوسری دھرتی سے مختلف کب تھی
وہی آبشاروں جیسے آبشار
وہی سرسبز وادیاں
وہی بانہوں جیسی ٹہنیاں
چشموں سے ابلتا ذائقہ دار پانی کوہ ساز
وہ لذت جوان کو اک سمت دے
اس کی کمی تھی
یہ کوہ شاز اپنی بے گانگی پہ خجل تھے
کہ ان پر کھڑے ہو کر
اذان دے
اور انھیں بھی معتبر بنادے

---

[۱] ''ارض بے پیغمبر'' مظہر مہدی

اس زمین کو بھی
حسن لازوال دے'' ۱؎

اسلام رواداری کا وہ بلند تصور ہے جو کہ تمام مذہبی نفرتوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے اس رواداری کو سب سے بڑا نقصان مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت سے ہوا۔ مشرقی تہذیب وتمدن کی راہ میں اسی ذہنیت نے رخنہ اندازیاں کیں ۔ جس نے انسان کو دولت کا حریص او رانسانوں سے زیادہ خود ایجاد کردہ مشینوں کا دلدادہ بنادیا۔ اوریہیں سے آغاز ہوا مغرب مشرق اور تیسری دنیا میں کشمکش کا۔ جس تہذیب واقدار کا انسان صدیوں سے گرویدہ ہو وہ اسکی تحفظ اور بقا کا بھی امین ہوتا ہے۔ وہ مشینی اور حیوانی طریقہ کار کو کسطرح اپنی زندگی کا حصہ بنا سکتا ہے۔ نیز ضروریات زندگی عیش پسندی روز بروز ترقی کرتی ہوئی سائنسی علوم کی کشش بھی اسے متاثر کرتی ہے اسکے زیراثر وہ مغربی تہذیب سے پہلوتہی بھی نہیں کرسکتا۔

اسلامی تعلیمات ایک تابناک حقیقت اور ایک روشن دلیل ہے اس نے بارہا باہمی محبت شفقت اور مساوات کا درس دیا ہے اور اس امر کا اعلان کیا ہے کہ انسانیت ایک وحدت ہے اور اخلاق انسانیت کا اہم جز ہے جیسا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ صباحی اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو میں رقمطراز ہیں

''ہماری تہذیب میں نوع بشر کو نفرت کینہ تفرقہ اور تعصب سے نجات دیکر اسے محبت تعاون فیاضی اور مساوات کا سبق سکھایا۔ اسلام مسلسل اس امر کا اعلان کرتا رہا ہے کہ انسانیت ایک وحدت ہے .... اسکا خیال ہے کہ تمام مساوی مذہب ایک سرچشمے سے پھوٹے ہیں۔

۱؎ ''اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو'' ڈاکٹر مصطفےٰ صباحی ص ۶۹

دین میں جبر وکراہ نہیں۔سب کی عبادت گاہیں قابل
احترام ہیں'' ۱۶؎

اسی مذہبی مزاج کے پیش نظر ہندوستان اور دیگر مما لک اولیاء اکرام اور صوفیائے اکرام کے ساتھ ساتھ شعراء نے بھی احترام انسانیت کو موضوع سخن بنایا۔ اور اپنی شاعری کے وسیلے سے انسانی دوستی ایثار و احترام اور یکسانیت کا جو اعلیٰ تصور پیش کیا وہ دوسرے مذاہب میں کم ہی ملتا ہے جدید شعراء بھی اس تہذیبی اقدار سے غافل نہیں رہے انھوں نے خود اپنی ذات کے اثبات اور اپنے وجود کے معنی دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اور شعری موضوعات کو اتنی توسیع عطا کی کہ وہ مختلف موضوع و متضاد خیالات و تصورات کی شکل میں سامنے آنے لگے۔

''خدا نے قرآن میں کہا ہے
کہ لوگوں میں نے
تمھاری خاطر فلک بنایا
فلک کو تاروں سے،
چاند سورج سے جگمگایا
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر زمیں بنائی
زمیں کے سینے پہ
ندیوں کی لکیریں کھینچیں
....
....

تمھاری خاطر یہ سب بنایا
مگر نہ بھولو
کہ ایک دن میں
یہ ساری چیزیں سمیٹ لوں گا
خدا نے جو کچھ کہا ہے
سچ ہے
مگر نہ جانے
وہ دن کہاں ہے
وہ آخری دن
کہ جب خدا یہ تمام چیزیں
سمیٹ لے گا
مجھے اسی دن کی جستجو ہے
کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں''[۱]

''گھر کے پاس اک مسجد ہے
مسجد سے
روزاذان کی آوازیں آتی ہیں
لوگ نمازیں پڑھنے جایا کرتے ہیں
اور میں اپنے گھر میں بیٹھا سوچتا ہوں

---

[۱] ''آخری دن کی تلاش'' محمد علوی ذہن جدید نظم نمبر ص ۸۷

ایک نہ اک دن
میں بھی مسجد میں جاؤں گا
لیکن جب
احباب اٹھا کر لے جائیں گے''

ساقی فاروقی اپنی نظم 'نوحہ' میں جدید تضوع آمیز بے رحم تمدن کے خلاف نوحہ کناں ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں۔

''میں بال روموں میں مر رہا ہوں
شراب خانوں میں جل رہا ہوں
جو میرے اندر دھڑک رہا ہے وہ مر رہا ہے ''

خودغرضی، عیش پرستی اور مغربی تمدن پر ساقی فاروقی کے تنقیدی نظریے میں شدت انگیزی کا سبب دراصل احترام انسانیت کا بیکراں ولولہ تھا۔جس نے انسانیت پر ہونے والے مظالم اور اسکی صلاحیت کو مجروح کرنے کی ہر کوشش پر اپنی برہمی کا اظہار کیا۔متحرک اور زندہ دل جو سینہ میں دھڑک رہا ہے، لمحہ۔لمحہ کر کے خود کو اپنی موت کا نوحہ خواں بنتا جارہا ہے لیکن شراب خانوں میں جلنے اور لمحہ لمحہ مرنے کے بجائے بلند حوصلگی اور یقین محکم کی ضرورت ہے اس امر حقیقی سے منھ کیسے موڑا جاسکتا ہے کہ عصر رواں، مرگ ناگہاں کے دہانے پر کھڑا ہے! انسان خود اپنے بنائے ہوئے گھروندے میں قید ہے اور یہ گھروندہ اس بستی میں آباد ہے جہاں کا مقدر ہی تباہی اور عذاب ہے، مزید یہ کہ انسان شہر آشوب سے نکلنے کے تمام راستے خود ہی مسدود کرتا جارہا ہے۔

''یہ عذابوں کا شہر ہے

ا ''عذابوں کا شہر'' صادق

یہاں خودکو بچانے کے تمام حربے
بے کار ثابت ہو گئے ہیں'' ۱؎

جدید مغربی تصورات نے احترام انسانیت پر جا بجا پوری قوت سے وار کئے ہیں لیکن عصر حاضر نے احترام انسانیت کیا؟ انسانیت کو ہی نیست و نابود کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ مشینوں کے ناجائز استعمال اور اسکی اہمیت وقوت کی پرستش نے دلوں کو احساس مروت وغمگساری سے بے بہرہ کر دیا ہے اس جذبے کی عدم موجودگی نے انسانی زندگی کو بے حد المناک بنا دیا۔ اور انسان کے وہ معصوم جذبات چھین لئے جو بے غرضی اور اخلاص کے غماز تھے۔ بشر نواز کے الفاظ دیدنی ہیں، ملاحضہ کریں۔

''خوف سلگتا آنسو بنکر
وقت کی پلکوں میں الجھا ہے
منظر منظر
اجلے پیکر
دھیرے دھیرے ڈوب رہے ہیں۔
اور ہم پاگل
سارے دریچے سب دروازے کر کے مقفل
اپنی اپنی تاریکی میں
اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔
اندھیارا کب اتنا گھنا تھا'' ۱؎

۱؎ ''اندھیارا کب اتنا گھنا تھا'' بشر نواز

بشر نواز کی یہ نظم اس بات کی غماز ہے کہ جدید تہذیب میں کسطرح انسانیت کو اذیت پہنچائی ہے انسان آہستہ آہستہ جدید تصنوع آمیز تہذیب وتمدن کی تاریکی میں غرق ہوتا جا رہا ہے اسکی زندگی لاانتہا عیش ومسرت سے ہمکنار ہوتے ہوئے بھی بے چینی اور اضطرابی کشمش میں مبتلا نظر آتی ہے۔

''سنو
اور یہ بھی سنو
اس زمیں پر مسرت اگے اسکا امکان کم ہے
کہ اب ایک روح شبانہ کی پرچھائیاں
تا بہ حد گماں
زہر پھیلا چکی ہیں
اب اس خاکداں کے مقدر میں
خوابوں کا اندوختہ بھی نہیں
ہاں.......خدا بھی نہیں
اس لئے کہہ رہا ہوں:
کہ اب زمیں پر مسرت اگے
اسکا امکان کم ہے'' [۱]

مسرت جسکی تلاش خواب بن چکی ہے انسان ہجوم میں تنہا اور معاشرہ جذبات انسانی کے مطالبات اور معاملات سے قطعاً بے نیاز ہے اسے شعور ہے تو صرف اجتماعی ضرورتوں کا اور معاشرتی اقتضاء کا۔ جدید شعراء نے اپنی شاعری کی بنا فلسفہ پر رکھی انکا خیال ہے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جسکے سہارے انسانی مسائل کو فروغ دیا جاسکتا ہے

---

[۱] ''فصل کوئی نہ کاٹے'' کمار پاشی ذہن جدید نمبر ۱۹ ص ۱۱۵

''کسی کو تخلیق حسن کی آرزو نہیں ہے
مقدس آگ ان کے دل کی یوں پیٹ کے جہنم میں جل رہی ہے۔
کہ زندگی کی جو قوتیں ہیں وہ صرف زندہ ہی رہنے میں صرف ہو رہی ہیں
مشین کی طرح ذہن کام بھی کر رہے ہیں
رگوں میں جیسے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا ہوا ہے
مشین کی طرح پاؤں چلتے ہیں
آدمی کا جلال گردش میں سرنگوں ہے'' [۱]

محمد علوی کی یہ نظم حرف بہ حرف صدا ہے اعہد حاضر کے انسانوں کیلئے۔

''تو پھر یوں مخاطب ہوا
ابن مریم نے اک اونچے ٹیلے پہ چڑھ کر کہا
سن رہے ہو
جہاں تم نے بویا نہیں ہے
وہاں کاٹنے کیوں چلے ہو
جہاں کچھ بکھیرا نہیں ہے
وہاں سے سمیٹو گے کیا؟
لاؤ اپنے گناہوں کے پشتارے لاؤ
انھیں دفن کردو
نیکیوں کے درختوں سے

---

۲ ''ابن مریم'' محمد علوی

لذت کے پھل مل سکیں گے'' ۲؎

ایسے عالم میں جہاں ایک وحشت گمنام انسانیت کے تعاقب میں ہو وہ شعراء ہی ثابت قدم نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے مذہبی اقدار کی پاسبانی کی ہے۔ سید امین اشرف ان شعراء میں سرفہرست ہیں۔ انکے یہاں جو صوفیانہ فکر انگیزی اور روحانی سرمستی ہے وہ زمین وآسمان کی جلوہ سامانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جسکی ترسیل کے لئے انھوں نے روشن اور دمکتے ہوئے محاکات تراشے ہیں جنکا سرچشمہ کائنات فطرت کی ثروت اور مظاہر ہیں ایسا لگتا ہے کہ امین اشرف نے اپنے مخلص جذبات کو روح کے اندر رچا بسا کر انھیں حرف وصوت کی انوکھی تزئین کاری کی وساطت سے آشکارا کیا ہے۔ جو جذبات واحساسات کی تطہیر اور تقطیع سے وجود میں آئی ہے۔

آج مغربی معاشرۂ فکر ونظر کی جن بنیادوں پر کھڑا ہے اسکے اثرات مشرق میں بھی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں ۔ مذہبی اقدار کی حد بندی آہستہ آہستہ ٹوٹتی جارہی ہے مذہب اوراخلاق سے بیزاری کی وجہ سے معاشرے اورفرد نے جوآزادیاں حاصل کرلی ہیں اس نے انسانی معاشرے کے ایک مثالی پیکر کو پاش پاش کردیا۔ معاشرے کی بنیادی اکائی' خاندان کا تصورمٹتا جارہاہے۔ خاندان میں فرض وشناشی اورایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داریاں ختم ہورہی ہیں آزادپسند معاشرے میں نہ تو مرد پرکوئی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی عورت پر دونوں ہی نام نہاد آزادی کے دلدادہ ہوتے جارہے ہیں ۔ اسی بڑھتی ہوئی بے قابو آزادی نے باہمی رشتے کومحض ہوس، ضرورت اورخواہشات کی تکمیل تک متعلق کررکھا ہے۔ مظہر امام نے اپنی نظم ' کنگال آدرش' میں اس جانب واضح اشارہ کیا ہے۔

''اپنے آدرش کی مفلسی مجھ پہ کیوں تھوپنا چاہتی ہو؟
یہ محبت کی بنجرز میں
جہاں پھول کھلتے نہیں
جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں
یہ محبت
جو چولھے سے بستر کی بھدی شکن تک ہی محدود ہے

ا؎ '' کنگال آدرش'' مظہر امام

یہ محبت نہیں

جبر ہے"[۱]

مظہر امام کی یہ نظم دنیاوی مصروفیات اور جذبات خلوص وحرارت کی عدم موجودگی کی زندہ مثال ہے۔شوہر بیوی کا وہ رشتہ جو اپنے وجود میں ایثار وقربانی محبت و ہمدردی کا ایک بے پایاں سمندر رکھتا تھا۔جدیدیت اس رشتے کو بھی بے رنگ کر رہی ہے۔جنسی ابہامیت پسندی کا دوردورہ ہے،جس کے احساس وادراک سے شعراء کافی متاثر نظر آتا ہے۔

"چوپائی سے آگے چل کر

اک فٹ پاتھ

تھوڑی دور بھیانک منظر دیکھ کے لیکن

ڈرسا گیا۔!

اک ننھی سی بچی کو

اک غنڈہ کیوں مار رہا تھا

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

کیوں بھائی............یہ کیا کرتے ہو!

وہ لیکن کڑک کے بولا

بوڑھے سالے بھاگ یہاں سے

میرا چاقو بہت گرم ہے۔!

تجھ کو۔اک دم

"دھڑان تختہ" کردے گا

کیا سمجھے.........؟

میں اک بے بس مریل بوڑھا

---

۱ "ایک ننھی طوائف کے نام" باقر مہدی

بیٹھ گیا........!
بچی لیکن چیخ چیخ کے روتی رہی۔
مرے آنسو چپکے چپکے بہتے رہے''۔[1]

باقر مہدی ایک باشعور اور اعلیٰ فہم شاعر ہیں اس نظم میں انھوں نے معاشرتی پس ماندگی تہذیبی پستی سے بار بار عوام کو آگاہ کیا ہے۔ معاشرے مین بڑھتے ہوئے ظلم و بربریت کا تذکرہ چپکے چپکے بہتے ہوئے آنسوؤں سے باشعور قاری سُن سکتا ہے۔

عصر رواں کی خواتین کی آزاد خیالی نے ان عورتوں کو مشرقی روایات سے بہت دور کر دیا ہے وہ شرم وحیا، عزت وانا جیسے الفاظ سے ناآشنا نظر آتی ہیں عیش کی ہوڑ میں وہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں کافی ماہر نظر آتی ہیں حسن وصداقت کے معنی بدلتے جارہے ہیں۔ مجبوراً شعراء نے بھی اپنی روش تبدیل کی۔

''میں نے اپنی روایات کے سارے لبادے اتارے
اپنے چہرے کو تہذیب کے رنگ وغازہ سے ناآشنا کر دیا۔
اپنے آدرش کے چاند تارے بجھائے
اور تب 'لوگ....
گندے' شریف اور ریاکار......
میری طرف پیار سے دیکھکر مسکرانے لگے!
اشک آمیز قصے سنانے سے حاصل؟
زخم خوردہ عقیدوں پہ مرہم لگانے سے کیا فائدہ
اپنی مجبوریوں کی جبیں پر بھی اب جھریاں پڑ چلیں
اپنے غم پر بھی افسردگی کی سفیدی جھلکنے لگی''

جب ہندوستانی عورت کے بدلتے ہوئے روپ اسکے مسائل معاشرتی حیثیت اورانسانی حقوق کیلئے بے انتہا جدجہد کا مطالعہ کیا گیا تو مغربی تہذیب ہی لازم وملزوم ملی جومعاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے ماقبل زیادہ تیز رفتاراورزیادہ نتیجہ خیزتھیں یہ وجہ تھی کہ سائنس اورٹکنالوجی کی رفتارترقی کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلیوں کا کردار بھی بدلتا اور پیچیدہ ہوتا گیا۔ جوآزادی کے خارجی اورداخلی عناصر پراثر انداز ہوتا رہا۔عمیق حنفی نے اس کے احساس کویوں بیان کیا۔

''کیوں رگ و پے میں سرایت کرر ہایہ سیاہ احساس
لمحہ لمحہ ختم ہوتا جار ہاہوں
آنکھ سے ٹپکے ہوئے اشکوں کے ساتھ
قطرہ قطرہ ختم!
نقطہ نقطہ ختم!
کچھ تبسم قرض لیکر
سود میں اپنے بدن کا گوشت ادا کرنے کے ہروعدے کے ساتھ!
ختم ہوتے جار ہے مجھ کواگر پا بھی گئی تو کیا کرے گی
موت مری جان موت'' [1]

''دیوتاؤں نے مجھ سے کہا تھا: کہ جب
چندر ماؤں کے آئینوں پہ گرد جم جائیگی
اورسورج سمندر کی گہرائیوں میں اتر جائیں گے
تب ہراک رنگ

---

[1] ''آئینہ خانے کے قیدی'' عمیق حنفی

کالک میں تبدیل ہو جائے گا
رستہ رستہ اندھیرے بکھر جائیں گے
اور تم کو ہوا بن کے، چپ چاپ
اندھے سفر پر نکلنا پڑے گا
ہزاروں برس موت کی وادیوں میں بھٹکنا پڑے گا ''

یہاں معاشرتی اور تہذیبی سطح پر جو کشمکش سامنے آتی ہے وہ آج برق رفتار دور میں بھی انسان کو قطرہ قطرہ اور نقطہ نقطہ ختم کرتی جارہی ہے۔ حالانکہ انسانیت کی شکستگی کا یہ عمل سست اور مفقود اثر کے اعتبار سے محدود ہی سہی پھر بھی ایک تباہ کن اور غیر توانا زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ارباب نشاط کے بالاخانوں میں بھی خوف و ہراس کے سائے باطنی محرکات سے زیادہ طاقتور نظر آتے ہیں۔

'' پالکیاں ڈولیاں، پردہ نشیں بیٹیاں کٹنیاں، شہزادیاں
چھپ کے نظر بازیاں
جاگتے ہوئے میکدے سوئی ہوئی بستیاں رات کے سناٹے میں سازشیں سرگوشیاں
ڈاکہ زنی، چوریاں
حسن کے بازار میں نائکہ اور نوچیاں
موٹریں، اسکوٹریں، رات، کلب، ناچ گھر، گوری جواں ناریاں، مدکی بھری گگریاں
مستیاں انگڑائیاں، مسکی ہوئی چولیاں،
ٹوٹی ہوئی چوڑیاں'' [1]

---

[1] ''ڈرامہ'' احسن احمد اشک نئی نظم کا سفر ص ۱۳۴

اشکؔ کی یہ نظم عصر حاضر کے ماحول اور معاشرت سے پوری طور پر جڑی ہوئی ہے کسی اعلیٰ طبقے کی پرشکوہ زندگی کا مطالعہ کرے یا غربت، مفلسی اور عام انسانوں کی سرگرمیوں پرنظر ڈالیں، تقدس، پاکبازی اور ریاکاری کا وصف حقیقی زندگی میں نایاب ہے۔ اسی اجتماعی عنصر کی تلاش میں ندافاضلی سرگرداں ہیں۔ ''آدمی کی تلاش''

ابھی مرا نہیں زندہ ہے آدمی
یہیں کہیں اسے ڈھونڈو یہیں کہیں ہوگا
بدن کی اندھی گپھا میں چھپا ہوا ہوگا
بڑھا کے ہاتھ ہر اک روشنی کو گل کردو
ہوائیں تیز ہیں جھنڈے لپیٹ کر رکھ دو
جو ہوسکے تو ان آنکھوں میں پٹیاں کس دو
نہ کوئی پاؤں کی آہٹ
نہ سانس کی آواز
ڈرا ہوا ہے کچھ اور بھی نہ ڈر جائے
بدن کی اندھی گپھا سے نہ کوچ کر جائے[1]

---

[1] ''آدمی کی تلاش'' ندافاضلی

باب پنجم

جدید نظم کے تقاضوں کا ذکر کرنا جدید شعراء کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنا او
ران کی ذمہ داریوں کو سخت کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس بات سے بھی آگاہ کرنا ہے کہ انھیں جدید نظم
کے مستقبل کی راہیں کسی طرح ہموار کرنی ہیں! لیکن ان سوالوات پر غور کرنے سے پہلے عصر
حاضر کی ان سچائیوں پر غور کرنا بہت ضروری ہے جن کا تجزیہ و تصفیہ بارہا مفکرین اردو نے کرنا چاہا
مگر ناکام رہے۔

(۱) سائنسی عقل پرستی
(۲) فکری ماحول میں ماضی کی اہمیت
(۳) عصر حاضر اور ماضی کے مابین خلیج
(۴) سیکولرزم اور انسانیت
(۵) سیکولر معاشرہ یا کلاسیکل معاشرہ
(۶) سیکولرزم وقت کی اہم ضرورت
(۷) مستقبل اور سیکولرزم

مجھے یہ ساری باتیں کہنے کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ ہماری آنکھوں کے
سامنے حالات کے بنائے ہوئے نئے ڈھانچے مسمار ہو رہے ہیں اور ہمیں ایسی آوازیں سنائی
دے رہی ہیں جو ان مسمار ہوتے ہوئے ماحول کی برتری پر اپنے انداز میں اصرار کر رہی ہیں

---

۶۲ ''نئی نظم کے تقاضے'' جیلانی کامران ذہن جدید ص ۹۶

فکری ماحول میں ماضی کی اہمیت کو گردانتے ہوئے جیلانی کامران کہتے ہیں :-

ہماری شاعری کی تاریخ میں سمت نمائی کی موجودگی اور سمت
نمائی اجزائے مخالفت سے رونما ہوئی ہے جب بھی مخالفت کے
عناصر ختم ہو جاتے ہیں تو سمت نمائی بھی محو ہو جاتی ہے اور
اسکے ساتھ شاعری کی تخلیق بھی رک جاتی ہے۔ ۶۲

اس خیال سے آپ متفق ہوں نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری شعری تربیت انھیں خطوط پر ہوتی ہے نظم کی تخلیق کے لئے جارحانہ اور مدافعانہ رویہ بے حد مددگار ثابت ہوتا ہے شاعر کے لئے معاشرہ ایک دشمن کی حیثیت سے آتا ہے اس معاشرہ کی دشمنی کے لئے ماضی حال مستقبل کی قید نہیں ہوتی بسا اوقات وہ یاد ماضی کی شکل میں آتا ہے جس کے مخالفت میں ایک فنکار اپنی تخلیقی دنیا میں سرگرداں رہتا ہے لیکن جب یہ مدافعانہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے تو تخلیقی عمل بے مقصد ہو جاتا ہے۔

حالانکہ جدیدیت، کے شیدائیوں نے اپنی تخلیقی رونمائی کے لئے کسی دشمن عناصر کی ضرورت کو نہیں محسوس کیا دشمنی کا تصور نئی نظم میں کم ہی ملتا ہے جدید شعراء کے یہاں انکار کے بجائے اقرار مخالفت کے بجائے مفاہمیت جارحانہ اقدام کی جگہ خوش اطواری اور نفرت کے بجائے محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں وہ اپنے اور کائنات کے درمیان تفاوتوں کو ختم کرنے کی سعی کرتے ہیں جن کا ذکر صرف شعری روایات میں ہی ملتا ہے فلسفی شعراء نے کہا زمین سنگ دل ہے اور دنیا مکروہ، جدید نظم کہتی ہے زمین رحم دل ہے اور دنیا خوبصورت قومی نظم کہتی ہے حاکم جفا کار ہے اور محکوم قیدی نئی نظم کا کہنا ہے حاکم اور محکوم کے چرچے ماضی سمیٹ چکا ہے سب انسان برابر ہیں اور سب کی تعدیر یکساں ہیں۔ ترقی پسند نظم نے یہ اعلان کیا کہ ہمارا معاشرہ بیمار ہے ہم بیمار ہیں ہماری اقدار بھی اس کے جراثیم سے متاثر ہو رہی ہے اس بات کوئی

نظم ماننے سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ معاشرے کو صحت مند بنانا ممکن ہے اور اس کے لئے کسی وسیلے کی بھی حاجت نہیں ہے یہ وہ مختلف نظریات ہیں جنھیں نظم از سر نو مناسب تغیر و تبدل کے ساتھ باہم مربوط کرتی ہے۔

بہر کیف اقتضائے زمانہ کے ساتھ اقتضائے نظم بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں دور حاضر ایک پر آشوب دور ہے جس میں ہمارے شعراء کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں اقتضائے زمانہ کو بروئے کار لائیں انھیں نہ ہی ماضی کی اہمیت کو فراموش کرنا ہے اور نہ ہی جدید ترین نظریات سے آنکھیں چرانا ہے انھیں دشمنی عناصر کا بھی سامنا کرنا ہے اور انسانیت سے دوستی کا رشتہ بھی برقرار رکھنا ہے ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ ہمارا ماضی ہماری تہذیبی اقدار سے زیادہ قریب تھا اور صحیح معنوں میں زیادہ حق شناس اور اپنی روایات سے زیادہ متعارف جیسے جیسے ہم جدیدیت کی جانب بڑھتے جارہے ہیں اس اقداری روایات اور ہمارے مابین فاصلے بڑھتے جارہے ہیں سائنس کی بڑھتی ہوئی ظاہری دلکشی نے اس کی اہمیت اور ضرورت کو دوبالا کر دیا ہے روز بروز ہوتے ہوئے سائنٹفک کرشمے ہمیں معتقد کرتے جارہے ہیں ہم ان ذہنوں کے پرستار ہوتے جارہے ہیں جو نت نئے تجربات میں سرگرداں ہیں اور حقیقی کرشمہ ساز کی تخلیقات کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں آج کے فنکار کو ضرورت حق شناسی کی ہے عقل پرستی کی نہیں جب تک جدیدیت اس بات پر غور نہیں کرے گی عصر حاضر اور ماضی کے مابین بڑھتے فاصلے خلیج میں تبدیل ہوتے رہیں گے یعنی انسانیت اور سیکولرزم پستی و تنزلی میں گم ہوتی رہے گی۔

فکری رائے عامہ ہے کہ دور کو سیکولرزم کی ضرورت رہی ہے خاص طور سے عصر حاضر تو اس ضرورت کا محتاج بن گیا ہے انسانیت کو جس شدت سے اس ضرورت کا احساس ہے یہ شے اسی قدر نایاب ہے و ناپید ہوتی جارہی ہے دن رات اتحاد و مساوات کے نغموں سے گونجتی فضائیں اب خوف و ہراس کے اندھیرے میں غرق ہوتی جارہی ہیں اس ماحول میں بھی

اگر کوئی سیکولر بننے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ ایک فنکار ہی ہوسکتا ہے۔ جس میں جدید شعراء بھی حوصلہ شکن ہیں آج کا سیکولر ماحول انھیں تنہائی کا احساس دلاتا ہے۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے خلیل الرحمن اعظمی :-

''دھوپ معمول سے بھی سوا تیر ہے
کوئی بادل کا ٹکڑا نہیں
کوئی سایہ نہیں
روشنی چڑھتے سورج کی یہ روشنی
مجھ کو گھیرے ہوئے ہے۔
ایسا لگتا ہے جیسے بہت بھیڑ ہو
ہر طرف شور وغل ہر طرف قہقہے
میں کسی سے کچھ کہنا چاہوں
تو شاید نہ اب کہہ سکوں'' [۱]

شعراء جن اقدار کے ذریعہ معاشرے کی نمائندگی کر رہے ہیں وہ خالصتاً سیکولر ہوتی ہیں لیکن انھیں سے غیر سیکولر اقدر بھی پیدا ہوجاتی ہیں جدید شاعر جس وقت کائنات کی ان دونوں منطقوں کو باہم مربوط کرلے تو اسے غیر فانی اشیاء اور مظاہرات کے پیچھے اک اسرار دکھائی دے گا جو اس کی شاعری کو تاثر اور لازوالی عطا کرے گا۔

اس لازوالی کو برقرار رکھنے کیلئے بارگاہ ایزدی میں شایر بار بار یہ دعا کرنی پڑے

''اے خدا تو ہمیں فاصلے دے
ہمیں کاٹ دے
سارے رشتون کو بنجر زمینوں میں
بونے کی توفیق دے

---

[۱] ''وجدان'' خلیل الرحمن اعظمی [۲] ''ایک اور دعا'' فضل تابش ص ۱۵۹

اے خدا!
ہمیں جنگ دے
رسمی دے
عداوت کی سوغات دے
تو کسی پیڑ پر پیار کے پھول کھلنے نہ دے'' ۲؎

معاشرتی تغیر پذیری اور سیاسی افراتفری میں شعراء کا قدیم روایت پر قائم رہنا غیر فطری بھی تھا اور غیر ممکن بھی دوسرے نقادوں کی طرح انکے یہاں بھی نئے اسالیب نئے موضوعات اور نئی لفظیات کا درآنا ایک فطری عمل تھا۔ ۱۹۷۰ء–۱۹۸۰ء کے عرصہ کو جدید شاعری کے عروج کا زمانہ کہا جاسکتا ہے ۱۹۷۰ء سے ۲۰۰۰ء میں جدید شعراء نے جو ارتقاء واستحکام حاصل کیا وہ قابل رشک اور قابل قدر ہے زندگی کے محبوس گوشوں کو اجاگر کرنے کا فن گھریلو مسائل سے دلچسپی ماضی کی قیمتی اقدار کی بازیافت۔ ضمنی میلانات انفرادی رجحانات کو سیاسی اور معاشرتی اقدار کے شکست وریخت کا براہ راست نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن یہ کہنا صریحاً غلط ہوگا کہ ان لوگوں کو سماجی مسائل سے دلچسپی نہیں حقیقت یہ ہے کہ انفرادیت کو پیش نظر رکھنے کے باوجود انکی شاعری اس دور کی آئینہ دار ہے۔

اس دور کے رسائل اور شعری انتخابات پر نظر کرنے سے زیرغور شعراء کی ایسی پوری فوج نظر آئیگی جو خود کو جدید کہتے ہیں یا جنھیں جدید سمجھا جاتا ہے ہندوستان کی حد تک جن شعراء نے مقبولیت حاصل کی انمیں عمیق حنفی کمار پاشی پروین شاکر۔ جنکو موت نے چھین لیا۔ قاضی سلیم اشاز نادرہی لکھتے ہیں باقر مہدی محمد علوی ندا فاضلی۔ شہریار زبیر رضوی وغیرہ ہیں یہ سبھی شعراء اب بھی عمل پیرا ہیں لیکن بدقسمتی سے انکا شعری ارتقا ایک خاص سطح تک پہونچ کر رک سا گیا ہے اس دور میں جدید رجحانات کے تحت خواہ قابل قدر شاعری نہ کی ہو لیکن یہ نئی

ضرورتھی اسکی جدیدیت کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ نئی شاعری کے تعلق سے احتشام حسینؔ اور علی سردار جعفریؔ وغیرہ نے نہ صرف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا بلکہ نئے شعراء پر طرح طرح کے الزام بھی عائد کئے ان الزامات میں سی۔ائی۔اے۔کا ایجنٹ ہونا بھی تھا اب یہ باتیں تاریخ بن چکی ہیں انکی تفصیل میں جانا وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ۶۰ء کے بعد یعنی ۷۰ء سے شعراء نے جدید شاعری کی سنجیدگی سے تخلیقات کیں اور عوام نے اسے اور دلچسپی سے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ نئے شعراء کی تعریف وتنقید کا جو جوش اس عرصہ میں تھا اب باقی نہیں رہا۔

آجکا دور شاعری کا دور کم اور نثر نگاری کا زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ شاعری میں دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد کم ہی ہے جو دو چار قاری ہیں وہ سوانح نگاری خاکہ نگاری وغیرہ سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں خود شعراء کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی صفحہ پر شائع مختلف شعرا اور دو چار نظموں میں سے اپنی نظم دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی طرح شعراء کی تعداد میں بھی آئے دن اضافہ ہو رہا ہے لیکن قارئین کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔

۸۰ء کے بعد نئے آنے والے شعراء میں مذکورہ شعراء کے علاوہ انکی شاعری اپنے پیش روؤں سے ملتی جلتی بھی ہے اور مختلف ومنحرف بھی کیا ان شعراء حضرات نے موجودہ شعری رجحانات میں کوئی اضافہ کی اا اور اگر کیا تو کس نوعیت کا یا عصر حاضر کے شعراء نے اس ردِ عمل کا اظہار کیوں نہ کیا جیسا کہ ترقی پسند شعراء نے جدید شعراء کے تعلق سے کیا تھا؟

دراصل ترقی پسند اور جدید شعراء کے درمیان اختلاف کی بنیادی نوعیت نظریاتی تھی مختلف شعری محاسن کو قبول کرنا یا انھیں نظر انداز کر دینا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کی نظریات وعقائد کے اختلاف کو برداشت کرنا۔ ۷۰ سے ۸۰ والی شاعری نسل کے مابین کوئی نظریاتی جھگڑا نہیں آج بھی جو شعراء ہمارے سامنے ہیں وہ کسی مخصوص سیاسی نظریہ سے وابستہ نہیں اور انسانیت کے ناطے انکے مسائل بھی تقریباً وہی ہیں جو انکے پیشتروں کے تھے۔ جیسے فرد اور معاشرے کے درمیان تصادم۔ طبقاتی کشمکش تہذیبی کشمکش اور اقدار کی پامالی فرد کی بے مائیگی۔

اور جذباتی ونفسیاتی انتشار۔ انسانیت کی بازیابی وغیرہ وغیرہ ان پیش رو پہلوؤں کے مناسب استقراء کے ساتھ ساتھ جو نئے تناظر ہمارے سامنے آئے اور جنکا عکس ہماری نظموں میں ظاہر ہوا وہ تیسری دنیا کے فروغ پذیر مسائل ٹکنالوجی کی یلغار وانفارمیشن ہائی وے پر دوڑتی برق رفتار زندگی ہے۔ صارفین معاشرے کی ضرورت سے زیادہ توسیع گلوبل کلچر، سیاسی جبر اور سرمائے کے تسلط کے نئے ضابطوں، نیوکلیائی اسلحوں کے امڈتے ہوئے خدشوں سے عبارت ہے انھیں کے ساتھ ساتھ ایک Paradoy کی طرح کسی قدر مذہبی وروحانی اقدار کا احیاء جمالیات ورومان کے نئے تلازمے زندگی کے تضادات کی پہچان بنائے رکھنے کے بجائے تضادات کی باہمی بقاء کو قبول کرنے کا شعور جیسے معاملات بھی ہمارے موجودہ قلم کے کینوس میں شامل ہوگئے ہیں۔

''میں دونوں آنکھیں میچے
گرتا پڑتا دوڑ رہا ہوں
آگے کیا ہے
مجھ کو کچھ معلوم نہیں
لیکن میری تیسری آنکھ
پیچھے بھاگتے رات ودن
سال اور صدیاں دیکھ رہی ہے
پیچھے دور بہت پیچھے
جھل مل کرتی
بجھتی خوشیاں دیکھ رہی ہے!
میں دونوں آنکھیں میچے
تیسری آنکھ سے روتا ہوں'' [۱]

---

[۱] ''تیسری آنکھ'' محمد علوی

شاعری کے آرٹ اور کرافٹ پر اگر دیکھیں تو غیر ضروری ابہام تجریدیت اور ہیئت کے تجربوں کی جگہ ابلاغ وترسیل پر زیادہ زور دیا جارہا ہے اور روائت سے انحراف محض کے بجائے کلاسیکل نظریہ سے از سر نو استفادہ کیا جارہا ہے خط مختنی محمد علوی کی شاعری اینٹی شاعری وغیرہ جیسی اصطلاحات تحلیل ہو چکی ہیں اور جدید شاعری زندگی کے ساتھ خارجی وداخلی دونوں سطح پر غیر مشروط ترسیل وتفہیم کا مطالعہ کرنے لگی ہے آج فنکار عالمی سطح پر تیزی سے بدلتی ہوئی اقداری ترجیحات اور واقعات کے، مدنظر وجود کے نئے استفہام سے اور فرد شاسی کے نئے نظریات سے دوچار ہے دورِ حاضر میں خیر وشر کی کشمکش نئی نظموں میں رونما ہورہی ہے اسی کشمکش نے خیروشر کے درمیان اور کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جسکے سبب روح مذہب ادارہ سازیوں کی دہلیز پر سسک رہی ہے شیطانیت نے متبادل صورتیں اختیار کررکھی ہیں تیسری دنیا مادیت اور روحانیت کے مابین لاینحل مسائل کے کوہ گراں میں پستی جارہی ہے نئے نئے فلسفوں کی یلغار میں اقداری زاویے زوال پذیر ہورہے ہیں خلاء میں رنگ برنگے باطل سیارے گردش کررہے ہیں ۔معروف دانشور ادیب دیوندر اسر نے اپنے مقالے ''مابعد جدیدیت کا منظر نامہ'' میں ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں:-

> ہم بڑے عجیب دور سے گذر رہے ہیں جنگجوؤں کے پاس
> جدید ٹکنالوجی اردوں کی اجارہ داری مہلک اسلحہ کالامحدود خزانہ
> ہے علم ودولت ملٹی میڈیا ہے اقدر کے مالک بھی وہی ہیں دراصل
> یہ ایک نئی برتری قوت کی مختلف مسلک اکائیکاں ہیں تشدد آمیز
> معاشرہ خارجی اساس، سماج، اشتہاری معثیت' سفاک سیاست
> مذہبی بنیاد پرستی دہشت گردی، مصلحت پسند دانشوری چھوٹے

---

۶۳ ''مابعد جدیدیت کا منظر نامہ'' دیوندر اسر

بڑے کی شہوت انگیز تشبیہیں کلچر کا رنیوال نظر فریب تماشے ایک
لذت پرست پاپلر کلچر اور ثقافتی کثافت کی پرورش کرر ہے ہیں۔'' ۶۳ے

ان حالات میں پرورش پا رہے انسان کے اعمال وسکنات پر شیطان بھی
حیران وپریشان بارگاہ ایزدی میں یوں نالۂ فغاں ہے:-

''خود ابلیس حیران ہے
خیر وشر کی کشمکش میں الجھ کر ہر اک بار یہ سوچتا ہے
خدایا میں مظلوم ہوں
میری فطرت میں جو سرکشی تھی آدم سے تھی
تیرا بندہ ہوں عاجز ہوں تو رحم کر
دیکھ اک مدت سے آدم کے بیٹے
تجھے اور مجھے بھول کر
صرف بے نام بے سود سی جستجو کے سہارے بڑھے جارہے ہیں
انھیں تیری رحمت تیرا قہر کچھ بھی ڈراتا نہیں
مجھے آج پہلی دفعہ ڈر لگا ہے
کہیں یہ تجھے اور مجھے قید کر کے
صرف تخلیق کے جرم میں وہ سزا دیں
جسکو لاکھوں برس سے یہ سہتے چلے آرہے ہیں''

جدید معاشرے کی دین اس نظم میں احتجاجی عنصر کے باوجود یہ کسی عزم سے
وابستہ ہیں اور نہ ہی اسکا لہجہ فلسفیانہ اور بلیغانہ ہے یہاں طبقے اور جمہور کی بات نہیں کی جارہی

ہے بلکہ معاشرتی انسلاکات اور فرد کی ذات اور اسکی شخصیت کو ابھارا جارہا ہے جدید فنکار مستعمل نوعیت کے موضوعات کو بھی نجی انداز میں پیش کرتے ہیں اس شعری رویہ کو جدید ترین شاعری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔۸۰ء کے بعد ابھرنے والے جدید ترین شعراء میں چند ایک کے علاوہ دیگر شعراء نے خواہ کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دیا ہو لیکن تخلیقات کے معیار کو جدید بنانے اور شعری سفر کو جاری رکھنے میں بڑا تعاون کیا تجربات کے روایتی معنی کے حدود سے بہت آگے نکل کر اپنا مقام بنانے کی کوشش کی۔

۱۹۸۰ء کے بعد جدید ترین مشہور شعراء نے غزل کے جانب توجہ دی مگر نظم پر وہ نظر عنایت نہ کی اردو نظم آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو رہی ہے اس کا اظہار زبیر رضوی نے ۶۰ کے جدید نظم نمبر کے ادارے میں یوں کیا ہے:-

> ''ہاں اب آگے لمبے سناٹے کا احساس ہوتا ہے اسی سنناٹے کو محسوس کر کے ایک ہول سا اٹھتا ہے کہ نظم جسکے ذریعہ آج اور آنے والے کل میں بڑی اور اہم شاعری کی جا سکتی ہے وہ مابعد جدیدیت کے برسوں میں تخلیقی سرخوشی میں تر بتر ہونے کو کیوں ترس گئی۔''[۶۴]

ان خیالات کے باوجود زبیر رضوی ۸۰ کے بعد نظموں پر مشتمل جدید نمبر نکالا ہے میرے خیال میں ۸۰ء کے بعد جدید شعراء نے نظموں پر زیادہ توجہ دی اسکی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انمیں غزل کی بندشوں کو جھیلنے کا حوصلہ نہ ہو نظمیں اور آزاد نثری نظمیں جدید فنکاروں کا مشغلہ رہا ہے حالیہ عرصہ میں بلراج کومل شہریار زبیر رضوی ندا فاضلی یوسف ظفر اور دیگر شعراء کی لاتعداد نظمیں رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں اقبال کے بعد اختر الایمان عظیم نظم نگار تھے انکے بعد نظم کی باگ ڈور کو جدید شعراء نے سنبھالا جن میں زبیر رضوی پیش پیش رہے نظم میں

---

[۶۴] ''ادارہ'' جدید نظم نمبر زبیر رضوی

سنجیدگی اختیار کرنے والے شعراء میں جمال اویسی سلیم انصاری اور عنبر بہرائچی کی نظموں میں نثریت ہے وہ نثری نظمیں لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آزاد نظموں میں بھی نثری آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

''میں صدیوں کی جمی مسافت کے انجام پر
اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں
کہ ایک دن جہاں سے جلا تھا
وہیں پہ کھڑا ہوں
میری زندگی دائرہ کا سفر ہے
نہ آنکھوں میں خوابوں کے خوشبو
نہ لہجے میں رخشندگی ہے
عجب بے بسی کے احساس نے
مجھکو شرمندگی کے مفاہیم سے آشنا کر دیا ہے
میں اپنے خون کی بکھری ہوئی ریت پر
نیم مردہ پڑا ہوں
انا سے شکست انا تک برہنہ
دعا سے شکست دعا تک برہنہ'' [۱]

''سفر زندگی کی علامت ہے لیکن
مجھے خوف آتا ہے گھر چھوڑنے سے
مجھے وہم سا ہو گیا ہے
کہ میں جب بھی نکلوں گھر سے

---

[۱] ''شکست دور'' سلیم انصاری [۲] ''سفر خدشات کا'' ذہن جدید نمبر ۲۸ ص ۲۷

کوئی میرے معصوم بچوں کی کلکاریاں
اور ہنسی چھین لے گا
کوئی میری بیوی کے چہرے سے
تابندگی چھین لے گا'' ۲

نثری نظم اور آزادغزل کا سلسلہ ایک ساتھ شروع ہوا تھا ماہنامہ' شاعر' نے
عرصہ ہوا ان اصناف مشترکہ کا ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا بعد میں کئی انتخاب آزادغزل کے
شائع ہوئے لیکن اسکو وہ مقبولیت نہ مل سکی جو نظم کو حاصل تھی آزادغزلوں کا رواج رفتہ رفتہ ختم
ہوگیا اب تو مظہر امام صاحب جو آزادغزل کی بنا رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے خود ہی اس صنف سے
توبہ کر چکے ہیں اور بہت ہی خلوص سے اسی انداز میں غزلیں کہتے ہیں جیسے پہلے کہتے تھے
احمد ہمیش کا دعویٰ ہے کہ نثری نظم کی بنا انھوں نے رکھی ہے لیکن انکا یہ جذبہ بے مصرف رہا نثری نظم
کی عدم مقبولیت کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں پہلی تو یہ کہ ابتدائی دور میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ خامہ
فکری کی بنا پر نظم تو کیا اچھی نثر کا ثانیہ تک نہیں بن سکیں دوسری وجہ یہ دیگر زبانوں کی طرح اردو کا
قاری بھی شاعری کے رموز نکات سے خوب واقف ہے وہ شاعری میں وہی اوزان و آہنگ
چاہتا ہے جسکی تلاش میں نظموں کا مطالعہ کرتا ہے اور جس سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ ان منفیات کے
باوجود گذشتہ دس پندرہ برسوں میں نثری نظمیں کہنے والے شعراء کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے
کئی شعراء اگر سہل پسندی کی وجہ سے اس صنف سے جڑے ہوئے ہیں تو کچھ جنکا گمان یا پھر
یقین کہ وہ اوزان کے سانچے میں رہکر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے انکو اظہار خیال کے
لئے آزادی اور وسعت کی ضرورت ہے لیکن تخلیقی اور تصوراتی نہیں انھوں نے علامتوں
استعاروں اور پیکر تراشی کا سہارا لیا مقامی کلچر اور تاریخ وسیاست کو بھی اہمیت دی مثلاً مظہر مہدی

کی ایک نظم کے چند مصرعے پیش ہیں ملاحظہ کریں:-

''ہم ظالم نہ وحشی درندے
بے بس روحیں خبر کا شکار
معشیت کی چکی میں پستی ہوئی
ہوس کے لبادوں کو نیا رنگ پیرہن دو
چلوتم! اپنے آلات حرب تیز کرلو
ہم اپنی ڈھالیں پھینک دیتے ہیں
ہمارے لہو کی بوندوں کو لعل ناب سمجھو
اور ملادو ہماری کراہوں کی تھاپ پر
رقص کرواور آسودہ ہو جاؤ''[۱]

مظہر مہدیؔ کی ایک اور نظم ''کہ اب تو نہیں ہے'' بھی اچھی نظم ہے اسمیں انھوں نے موجودہ دور میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے اسکے علاوہ شبنم عشائیؔ نعمان شوقؔ شاید جمیل جنیت پرمار چندر بھان خیالؔ رونق نعیم اور کئی دوسرے شعراء نے ۱۹۸۰ء کے بعد خاصی تعداد میں نثری نظمیں تخلیق کیں۔ مختلف دور کی مانند اس دور میں بھی شعراء کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے لیکن ایک مخصوص موضوع کی جھلک جو بیشتر شعراء کے یہاں نظر آتی ہے وہ ہے مذہب۔ جدید شعراء میں کمار پاشی کو ہندوازم سے کافی دلچسپی تھی اسکا اندازہ ''ایودھیا میں آرہا ہوں'' اس نظم سے لگایا جاسکتا ہے یوں تو صلاح الدین پرویزؔ عنبر بہرائچی کو بھی ہندوازم اور ہندو آریائی تہذیب سے غیر معمولی شغف ہے۔

چند اور شعراء جنھوں نے ۲۰ برسوں میں اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی اُنمیں بطور خاص غیاث متینؔ علی ظہیرؔ اور ابرہیم اشکؔ وغیرہ شامل ہیں انکی نظموں میں زندگی کی

---

[۱] ''دوست، کے دشمن کے لئے ایک نظم'' مظہر مہدی

کافی رمق موجود ہے۔ یہ سارے شعراء تشکیلی و تعمیری دور سے گذر رہے ہیں کون کتنا آگے نکل سکتا ہے یا کس مقام تک پہونچ سکتا ہے! اسکا فیصلہ تو وقت کے ہاتھوں ہے۔

جدید شاعری کی تاریخ میں صرف ہندوستان کی حد تک ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں اپنا مقام بنانے والوں میں صرف چند شعراء ہی نامزد کئے جا سکتے ہیں۔ جسمیں پہلا نام صلاح الدین پرویز کا ہے انھوں نے ۷۰ء کے بعد ہی شاعری کی شروعات کی اور ۸۰ء تک ایک خاص پہچان بنالی۔ پچھلے ۲۰، ۲۵ / برسوں میں انھوں نے بہت کچھ اور بہت خوب تخلیات کیں حقیقت تو یہ ہے انکے ہمعصر شعراء بھی ان سے پیچھے رہ گئے انکا شعری تاثر بہت اثر پذیر اور دیرپا ہے اختر الایمان سے انکی وابستگی نے انھیں ایک جدید اور منفرد راستے کے تعین میں مدد کی جسکی تقلید محال ہی نہیں غیر ممکن بھی ہے۔

دوسرا نام عنبر بہرائچی کا ہے جنکا دائرہ فکر و فن بھی کافی قابل قدر ہے موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے عنبر نے بھی عصر حاضر کو ہی ترجیح دی اور اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا انکی بہت سے نظموں کی زبان وہی ہے جو دوسرے ہمعصر شعراء کی ہے مگر مخصوص انداز بیان نے دلکشی پیدا کر دی ہے۔ سرور صاحب کا خیال ہے:-

> ''عنبر بہرائچی کی شاعری میں فطرت کا حسن ہے مشرقی یوپی کی دھرتی کی بو باس ہے پیڑ پودوں دریاؤں جنگلوں کچے مکانوں تالابوں معصوم شریں امنگوں اور تلخ حقائق کی دھوپ چھاؤں ہے دوسرے الفاظ میں عنبر ہمارے پہلے دیہی جدید شاعر ہیں اور یہی انکا حصار ہے دیہی شاعر کی جو عکاسی انھوں نے کی ہے وہ کہیں اور نہیں۔''

عصر حاضر میں نظم کا مزاج متعین کرنے میں زبیر رضوی شہریار ندا فضلی کا اہم رول ہے انکے بیشتر معاصرین کو ایک فکری تساہلی اور تخلیقی تھکن کا احساس ہوتا ہے اور انکا تذکرہ بالعموم ہم انکی پسماندہ تخلیقات کے حوالے سے کرتے ہیں۔ مذکورہ شعراء کی بصیرت اب تک متحرک ہے اور تجربوں کی نئی منزلوں کی جانب گامزن ہے۔

زبیر رضوی کی ۸۰ء کے بعد کی تخلیقات ہی وجہ افتخار ثابت ہوئیں ان نظموں میں ماضی وحال کی آمیزش اسطرح ہوئی ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا محال ہے زبیر رضوی کی یہ نظمیں جمالیاتی حصار کو توڑنے کی ایک اور کوشش ہے جسمیں وہ عرصہ دراز تک مقید رہی۔

ندا فاضلی کے یہاں ڈرامائیت کا جوش ہے اور ایک خاص وصف مقامی زبانوں کی شعری روایات کے مخصوص عناصر کا استعمال ہے یہ وصف انھوں نے دیہہ علاقوں کی خوبصورت بودوباش سے حاصل کیا ہے گیتوں کی نعمگی اور دوہوں کا ارتکاز ندا کی نظموں کو ایک موثر لہجہ عطا کرتا ہے ندا کی ترقی پذیری نے انھیں معاشرتی اور سیاسی معنویت عطا کی ہے عہد پر آشوب کے مسائل اور تبصرے انکی تخلیقات کو ایک نئی جہت اور نئی روش سے روشناس کراتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ۱۹۷۰ء کے بعد سے اب تک شاعری کا بہت ہی خوشگوار سفر طے کیا انکے شعری مجموعے ''چار سمت کا دریا'' ''سبز اندر سبز'' ''آسماں تہہ محراب'' ہیں فاروقی کی تخلیقی بنا بھی ماضی کی روایت سے پیوست ہے البتہ فاروقی صاحب کی توجہ تعمیراتی شاعری پر مرکوز ہے جسکے واضح تصور کے باوجود الہامی کیفیت کا احساس بھی ملتا ہے ''بیت عنکبوت'' تیشئہ ساعت کا غبار'' ''بن عرف نفسہ'' ارتباط منسوخ کے مرثیہ خواں'' اور انکی منظوم خودنوشت'' اپنی مشکل پسندی اور استعاراتی پیرائے کی دلکشی کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔

ترقی پسند شعراء نے اپنی شاعری میں عورت کی مساوی حیثیت پر زور دیا ہے اسکو محبوبہ کے ساتھ رفیق کہا آنچل کو پرچم بنانے کی ترغیب دی حسن کے نام سلام بھیجے فطرت کے پیار آفریں نغمے سنانے کے ساتھ ہی بغاوت کا راگ بھی سنایا گیا اور ساز بیداری اٹھانے کی توقع بھی اسی سے کی گئی۔ بقول شارب ردولوی :-

''ترقی پسند تحریک، کے اثر کے تحت اسکے روایتی تصور میں تبدیلی آئی اور شعوری طور پر اسکے مسائل یا زندگی کی دوڑ میں اسکے برابر ہونے کا احساس ہونے لگا۔'' ۶۴

جدیدیت کے اس بڑھتے ہوئے میلانات میں ہماری شاعرات بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں ان کا تخلیقی عمل ایک بیدار شعور کی بہتر دلیل تھا انھوں نے ان مسائل کی نشاندہی خود کی جو آزاد تعلیم یافتہ عورت کو درپیش ہیں رفتہ رفتہ شاعری میں عورت کی وہ تصویر ابھری جو اسکے روپ کی نفی کرتی ہے۔

''فلسفہ
تڑپ دلی کی

---

۶۴ ''ترقی پسند فسانے میں عورت کا کردار'' شارب ردولوی

تمنائے طلسم
دردِ ہستی کی چبھن
تلخ کامی کی مٹھاس
لوگ سمجھے میری ذات کا حصہ ہیں
مجھکو ہنگامۂ عالم سے سروکار ہے کیا''

بیشک یہ سارے متضاد جذبات اسکی چھوٹی سی کائنات میں موجزن رہے اور وہ بھی زندگی کی کشمکش کا محاسبہ کرنے لگی جسکی حوصلہ شکنی کی کوشش برابر جاری رہیں

''مجھکو اس رنگ میں گر دیکھا
تو گھبرا گئے کترا گئے لوگ
میرے احساس کو پھانسی دے دی
مجھکو گمنامی کے غاروں میں ڈھکیلا
یہ کہاں میری دلکش تصویر
قرنوں نے سجا رکھی تھی
میں وہ تصویر نہیں
نقش بہ دیوار نہیں''

ان اجتماعی مراحل سے جدید شاعرات بیحد استقلال کے ساتھ گذر رہی ہیں انھوں نے عورت کے وجود اسکی حیثیت اسکے ذہنی تصادم اور بے زباں مطالبوں کو قوتِ گویائی ہی عطا نہیں کی بلکہ معاشرتی ناہمواریوں اور نفسیاتی مسائل کو بھی بروئے کار لائیں عورت کا ایک مکمل

تصور اوراسکے خیال کا ایک مستحکم نظریہ جدید شاعرات کے یہاں پوری شدت سے ابھرتا نظرآتا ہے پامالئ حقوق پر برہمی حوصلہ شکنی پر یقین واعتماد کی فراہمی انکے یہاں مکمل طور پر نظرآتی ہے مگر اظہار کے پیرایہ میں اختلاف ہے۔ ان شاعرات میں شفیق فاطمہ شعریٰ فہمیدہ ریاض کشورناہید پروین شاکر رفعیہ شبنم عابدی بلقیس طیفر الحسن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ شاعرات نے اپنی توانا آواز اور موثر لب ولہجہ کے ساتھ اپنے حقوق کا مطالبہ کیا وہ اپنی حیثیت و اختیارات کیلئے بار بار آوازیں بلند کرتی ہیں یہ سوال انکے ذہن میں ہمیشہ کھٹکتا رہا کہ خواتین کی باریابی کے معیاراور بازیابی کے شرائط کیوں جدا ہیں؟

ان آوازوں میں سب سے اہم اور توانا آواز کشورناہید کی ہے وہ محض شاعرہ ہی نہیں ہیں بلکہ طبقات نسواں کی زبردست علمبرار ہیں کشور نے اپنے شعری انفرادیت پر یگانیت کو ترجیح دی وہ عورت کو کسی خاص مقام پر دیکھنے دیکھانے کی متلاشی نہیں بلکہ اسے بشریت کے اس اعلیٰ مقام تک لے جانا چاہتی ہیں جہاں افراط تفریط کی ساری تحدید ختم ہو جاتی ہوں۔

''یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے کچے دھاگے ہیں
سب پتھر ہیں
انکے اوپر چلوتو لہولہان
انکوسہوتو بھی لہولہان
پر اپنے لئے جینا کیوں ممکن ہے'' [1]

کشورناہید کے ساتھ فہمیدہ ریاض پروین شاکر شفیق فاطمہ شعریٰ نے بارہا حقیقی مساوات پر اسرار کیا اور اسکے جواز کو ایک مسئلہ بنا دیا محض سراعات کی بخشش مسئلے کا حل نہیں ہے پہلے عورت کے جذباتی اور نفسیاتی پہلوں کو تسلیم کرنا پڑیگا تب کہیں جاکے باہمی شرکتیں

---

[1] ''کشورناہد'' [2] فہمیدہ ریاض

ممکن ہوسکتی ہیں فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر نے بھی اپنی جن نظموں میں ان پر گرفت کی ہے اسمیں فکروفہم کوزیادہ چیلنج کیا گیا ہے۔

''یہ بچیاں ہیں
کہ جنکے سر پر بھرا جو حضرت کا دست شفقت
تو کمسنی کے لہو سے ریش سفید رنگیں ہوگئی ہے
حضور کے مجلئہ معطر میں زندگی خون روگئی ہے ۲؎

یہ نظم فہمیدہ کی جرأتمندانہ خیالات اور مستحکم اعتماد کی مکمل تصویر ہے اس نظم کا مخاطب حرم سرائی تہذیب کا وہ نمائندہ ہے جسکے شکنجوں میں عورت محض ایک بے بس پرندہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

دورجدید میں شاعرات نے اسی پرآشوب دور کے عطا کردہ مواد سے فکروفن کے چراغ جلائے ہیں اورعورت کے ان مسائل کی نشاندہی اس بیباک انداز سے کی جسے زبان قلم عطا کرنے کیلئے بڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔اسمیں جہاں ایک طرف نسائی جذبات کی ترجمانی ہےتو دوسری طرف چوراہوں کی آگ جب گھروں میں داخل ہوئی تو اس قسم کے اشعار کی تخلیق کا موجب بنی۔

پا بہ دل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کاٹے مری زنجیر کون
میری چادر تو چھنی تھی رات کی تنہائی میں
میری اس بے ردائی کی دے گیا تشہیر کون

انکے اس بیباک انداز پر الزامات لگائے گئے انھیں ایک فحش شاعرہ کے

خطاب سے نوازا گیا۔ لیکن اگر اس قسم کے خیالات فحاشی ہو سکتے ہیں تو یہ فحاشی معاشرے میں فروغ کیوں پا رہی ہے؟

شاعر یا ادیب ایک حساس ذہن رکھتا ہے اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر کے اسکی تخلیقات وجود میں آتی ہیں پروین شاکر نے بھی انھیں تلخ حقائق کو شاعری کا موضوع بنایا جو آج معاشرے کا ناسور بن گئی ہے پروین شاکر نے جو کچھ کہا اگر اسے انصاف کی نظروں سے دیکھا جائے تو وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے انھوں نے معاشرے کے ان تاریک دردناک پہلو کی عکاسی کی ہے جنکو خال خال لوگوں نے موضوع بنایا ہے یہ یہی وجہ ہے کہ نقادوں نے انکے اس انداز بیان پر تنقید کی لیکن ذہن اس خیال پر مائل نہ ہو سکا کہ انکو یہ بیباک زباں کسنے عطا کی یا اس بیباکی میں کتنے کرب نہاں ہیں' عورت جو فطرتاً معصوم اور شرم کا پیکر کہی گئی پروین شاکر بھی اس فطری عورت سے مختلف نہیں اسکی مکمل جھلک انکی شاعری میں ملتی ہے۔

ایک عام سی لڑکی ہوں بہت عام سی خواہش ہے
ایک گھر ہو دریچہ ہو معصوم سا بچہ ہو

یہ شعر انکی مشرقیت کا پیکر اور سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن جب وہ اپنی ذات سے ہٹکر سوچتی ہیں اور اپنے اطراف میں پھیلی ہوئی برائیوں اور عورت سے منسوب ناانصافیوں پر نظر جاتی ہے تو اسکے بے زبان مطالبوں معصوم خواہشوں اور حقوق کی تکمیل کی خاطر وہ آواز بلند کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

پروین شاکر کی رومان پرور اور توانائی بخش آواز آج ہمارے درمیاں تو نہیں انکی طنزیہ خطابت اور فکر و شعور سے ماخز اخلاقی جذبات کی بازگشت اردو شاعری کی فضاء میں ہمیشہ مترنم رہیگی۔

---

۱ ''فہمیدہ ریاض''

تباہی کے قاصد میری جاں میرے سبز پا
خداوندا ابلیس تیرے ارادون میں برکت کرے
کتاب نحوست سے نکلی ہوئی تیری بد فال کو
حافظ خوش دہن کی طرح وصف تکمیل دے ۱

اس نوع کی نظموں میں طعن و تشیغ کی لے زیادہ اونچی ہوجاتی ہے جسمیں صدمہ وضرب پہنچانے کی بھرپور صلاحیت ہے مگر یہ اثر کی قوت سے جلد محروم ہوجاتی ہے جو آہستہ آہستہ دل ودماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اسکے برعکس پروین شاکر کی رومانی نظمیں دیرپا تاثر قائم رکھنے میں کافی کامیاب ہیں۔

''وہ جاچکا ہے
مگر جدائی سے قبل کا
ایک نرم لمحہ
ٹھہر گیا ہے
میری ہتھیلی کی پشت پر
زندگی میں
پہلی کا چاند بنکر'' ۱

''ہر نئے سال کی اک تازہ صلیب
میرے بے رنگ دریچوں میں گڑی
قرض زیبائی طلب کرتی رہی
اور میں تقدیر کی مشاطئہ مجبور کی مانند ادھر

---

۱ ''الوداعیہ'' پروین شاکر خودکلامی ۲ ''بائیسویں صلیب'' پروین شاکر

اپنے خوابوں کا لہو لے لے کر
دستِ قاتل کی حنا بندی میں مصروف رہی
اور یہاں تک صلیبیں مری قامت سے بڑی ہونے لگیں'' ۲

ہمارے جدید شعراء کو اقتصادی سیاسی اور معاشرتی مسائل ہی درپیش تھے مگر شاعرات ان مسائل کے ساتھ ساتھ اس ازلی جنگ کے خلاف بھی قلم اٹھاتی رہیں جو صرف خواتین کے ناطے انھیں درپیش تھے یہ شاعرات فہم ادراک کی منزلوں سے جیسے جیسے آگے بڑھتی گئیں ان میں اس شعوری جنگ کا جذبہ تیز تر ہوتا جس میں سنسنی خیزی اور فوری ردعمل نمایاں ہے۔

''تمھاری طرح مجھکو خدا نے............اک وجود اپنا دیا ہے
کسی کم تر خدا کی خلق کردہ کیوں سمجھتے ہو
تمھارا جو خدا ہے وہی میرا بھی خدا ہے
تمھاری وضع کردہ زندگی جیتی رہوں میں
یہ تم کیوں چاہتے ہو؟
مجھے محفوظ رکھنے کا بہانہ مت تراشو.......شکریہ
تمہاری طرح اپنی زندگی میں آپ جینا چاہتی ہوں
مجھے جینے کا حق اتنا ہی ہے۔ جتنا تمھیں ہے'' ۱

فکر و اظہار کے درمیان پوری یگانگت کے جذبات کی اس نظم میں معاشرتی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب ان شاعرات نے ذہنی کشمکش' ناہمواریوں کا احساس اپنی ذات کی توثیق' اور اپنے وجود کے اثبات و جواز جیسے مسائل کو ہی سرفہرست رکھا یہی وجہ ہے کہ وہ ذہنی

۱ ''ایک نظم''، بلقیس ظفیر الحسن

رسائی اور پاکیزگی جسکے سبب ہمارے شعراءشہرت کی اعلیٰ سطح تک پہنچ گئے ہیں انھیں حاصل نہ ہوسکی۔ شفیق فاطمہ ظفیر الحسن ساجدہ زیدی عذرا عباس ادا جعفری اکثر نظموں میں زندگی کی ازلی خواہش کے جذبے کا شدید مطالبہ ودیگر مسائل کی جانب بھی رو بہ رجحان ہیں ان شاعرات نے جس تنہائی بے بسی اور محرومی کا بار بار حوالہ دیا ہے وہ انکا ذاتی مسئلہ تو نہیں، وجودی مسئلہ ضرور ہے ہماری جدید شاعرات نے ذات دگر میں شرکت کا دم بھرا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ شمولیت ایک دوسرے کے تعاون سے ہی اپنے معنی کی تکمیل کر سکتی ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ عہد حاضر کی ایک منفرد تخلیق کار ہیں جنکی صلاحیت اور انفرادیت کا اعتراف بیس سال قبل ہو چکا تھا انکا شاعرانہ ذوق کلاسیکل ہے یہی وجہ ہے کہ انکے موضوعات بلند کوشش اور متنوع ہوتے ہیں وہ ہمیشہ جدید اور غیر معمولی الفاظ کی جویا نظر آتی ہیں شعریٰ کی تقریباً ہر نظم ہستئی قطعیت سے گریز کی ایک توانا مثال ہے صدالبصحرا بازگشت، زوال عہد تمنا ارض موعودٰ یاشفیع الامم اور چراغ تہ داماں جیسی نظمیں کلاسیکی ضبط کے باوصف فکروفن کے جدید تجربات ہیں صدالبصحرا کے چند اشعار محل نگاہ ہیں

''یہ کیسی آگہی ہے جسکی مشعل ہاتھ میں لیکر
سدا تنہائیوں کے دیس میں پھرتی ہوں آوارہ
یہ اک پیہم شکست خواب یہ چھولوں تو کیا ہوگا
اسی سے ہوگئی یہ عشرت موجود صد پارہ
بجز اک روح نالاں چشم حیراں عمر سرگرداں
نہیں تقصیر پرواز نظر کا کوئی کفارہ'' [۱]

''تیری رہ گزر میں دھڑک اٹھا دل زار پھر

---

[۱] ''صدالبصحرا'' ''چراغ تہ داماں'' شفیق فاطمہ شعریٰ

نہ کبھی ملے نہ کبھی قرینے سے بات کی
غم کائنات کی اوٹ میں نہ بیاں ہوئیں
وہ ادھوری پوری کہانیاں غم ذات کی
کہ انھیں سنانے اور سننے کا حق نہ تھا'' ؎۲

جدید شاعرات کی فہرست میں توسیع کی جاسکتی ہے بالخصوص شایسپ حبیب زاہدہ زیدی طلعت زیدی رفعیہ شبنم ادا جعفری جیسی فنکاروں نے محض مستورات کے دکھ درد اسکی مجبوریوں اور پسپائیوں کی ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ موجودہ دور میں پروان چڑھنے والی فلسفیانہ تحریکات جدید اسالیب اور نظم کی تجربات میں بھی پیش پیش رہیں اور اپنی شخصی توانائیوں کو محسوس کیا جیسے زاہدہ زیدی نے اپنی مختصر سی نظم 'بزم' میں یوں آشکارا کیا ہے:-

''جلاؤ شمع دل
کہ رفتہ رفتہ
کوہ تیرگی
پگھل سکے
اٹھاؤ ساز دل
کہ اجنبی صداؤں کی یہ شور
ایک راگنی میں
ڈھل سکے'' ؎۱

گھریلو ماحول سے متعلق لطیف جذبوں خشیوں اور مسئلوں کے حصار سے نکل کر اجتماعی زندگی کا محاصرہ کیا جسکے بحران وتصادمات انکے یہاں بھی موجزن ہے اخلاقی

؎۱ ''بزم'' زاہدہ زیدی

پسماندگی جہالت تشدد اور استحصال کی وہ تصویریں جسے ترقی پسند ہاتھوں نے گہرے اور بھڑ کیلے رنگوں سے بنائی تھیں ان شاعرات نے اس کو ذاتی واردات اور حقائق زندگی کے ساتھ نیچرل رنگوں میں پیش کر دیا ان کی نظمیں نثری ہیں اور تکنیک بیانیہ ہے اکثر تمثیلی پیرایہ کو بھی بروے کار لایا گیا ہے تمثیل کا یہ انداز ادا جعفری کے یہاں بھی ملتا ہے انھوں نے اسی اسلوب کے ذریعہ نظم کے داخلی کینوس کو وسیع کیا ہے۔

ہماری جدید شاعرات کے تجربات اپنے عہد سے پوری طور پر اپنا رشتہ استوار رکھتی ہیں لفظ و معنی کی وہ بحثیں جو آج ہمارے درمیان چل رہی ہیں اسمیں انکی شرکت قابل فخر ہے وہ زندگی کے مختلف مسائل کا مشاہدہ و مطالعہ اور اسکا حل مختلف نقطہ نظر سے کرنے میں کوشاں ہیں۔

تخلیق کار کچھ خاص موضوعات کے سہارے اپنی تخلیقات کو مختلف پیکر میں ڈھالتا ہے یہ پیکر اسکی بصیرت کا میعار ہوتے ہیں کشور ناہید نے اپنی اعلیٰ میعاری کے ساتھ ''لب گویا'' سے ''میں پچھلے جنم میں رات تھی'' تک شعور اور تخلیقی تجربے دونوں کے سطحی امتزاج سے ایک طویل مسافت طے کی ہے اس کے ابتدائی مراحل اور موجودہ صورت حال میں بیحد اختلاف ہے مگر وہ ساری فصاحت جو ابتدا سے ارتقاء تک قائم رہی وہ انکی تخلیقی ریاضت ہے اور یہ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ نئے راستوں کی تلاش برابر جاری ہے کشور ناہید کے یہاں عام شاعرات کی طرح کبھی خوف کا احساس نہیں ملتا تاہم حال کی نظموں میں انکا اپنا سایہ بہت سے سوالوں میں تحلیل ہوتا نظر آتا ہے اس نظریہ سے ایک نئی اسطور (Myth) مرتب کی جاسکتی ہے جو زندگی کے تمام مسائل کو اپنی گرفت میں لے سکتی ہے ان نظموں کا سب سے نمایاں پہلو غیر شاعرانہ آہنگ اور شاعری کا فرسودہ روایات سے انحراف ہے

''سانس بھی اکھری تھی

جب ہوا ادھر آئی

بادلوں نے پوچھا تھا
کیا قیاس کرتی ہو
آنگنوں کا بنجر پن
کیسے دھو سکو گی تم
کس طرف کی خواہش ہے
آسمان گردی کی
اب کدھر نکل آئیں
سانس بھی اکہری ہے
رات کے ررتیچے میں
صبح کی اداسی نے
پیر جب رکھا ہوگا
حرف جل گئے، ہونگے
پھول کی نشانی بھی
خاک ہوگئی ہوگی
دل صبا صفت ٹھہرا
دامان رفاقت کو بار بار مسلا ہے
بار ہا جنوں دریا رخ بدل گیا دل میں
پیاس بھی کہ ٹھہری تھی
سانس بھی اکہری تھی
جب ہوا ادھر آئی'' [۱]

---

[۱] ''پیالہ بھر آگ'' [۲] ''بگولہ'' کشور ناہید

"جھیل پہ ٹھہری دھند کی طرح
وہ مرے اندر ہے
رات کے اندھیرے اور خاموشی کی طرح
وہ میرے ساتھ ہے
یہ کیسا رشتہ ہے" ۲

"اے خدا تیرا شکریہ
تو نے مجھے خوبصورت نہیں بنایا
تو نے میرے وجود کو غموں کی
آماجگاہ بنایا
زندگی کی پہلی صبح سے
زندگی کی ادھوری شام تک
میں نے شعلوں کی رنگت
اور تمازت کو سرخرو رکھا ہے" ۱

کشور ناہد کی بیشتر نظمیں اپنی ذات کے گردوپیش کی کائنات تک پہنچنے اور اسکو سمجھنے کا ذریعہ بنی ہیں اور ہمعصر نمائندہ شاعرات کی طرح ایک نمائندہ سماجی سیاسی بیان واعتراف اپنے عہد سے وابستہ سوالوں اور مسئلوں پر ایک تخلیقی تبصرے کی حیثیت بھی رکھتی ہیں موضوع گفتگو" بگولہ" جلے ہوئے گھر سے دریافت شدہ نظم" رستوں کی دلدل اور خود کلامی جیسی نظمیں انکے تجربات میں آنے والے ایک مخصوص مسئلہ عورت مرد کے رشتے رفاقت ہمغری کا احاطہ کرتی ہیں۔

---

۱ "ساحل پہ کھڑی ایک نظم" کشور ناہد ذہن جدید نمبر ۳۰

پچھلے برسوں میں شائع ہونے والی شاعرات کے مجموعے بالخصوص فہمیدہ ریاض کا مجموعہ'' آدمی کی زندگی'' نسرین انجم بھٹی کا مجموعہ'' بن باس'' یاعذرا عباس تنویر انجم ظیفر الحسن کی متعدد نظمیں نفعالیت اور پسپائی کے احساس سے حیرت انگیز طور پر عاری ہیں دردمندی اور افسردگی کی ایک خاموش الہر کے ہوتے ہوئے بھی انکی نظموں میں اپنے ماضی یا حال سے زیادہ مستقبل کی جھلک ایک نئی جمالیاتی قدر کے طور پر ابھری ہے ان سب کی شاعری ایک واضح معاشرتی و سیاسی جہات رکھتی ہے انکی تخلیقات ہمعصر شاعرات بمثال پروین شاکر زہرہ نگار بیگم ادا جعفری کے کلام سے بالکل مختلف جمالیاتی تاثر رکھتی ہیں۔

جدید ترین شاعری کے حامی و پیامی شعرانے اپنے اظہار کے لئے نثری نظم کا انتخاب کیا یہ اردو نظم کے حق میں فال نیک نہیں آج سب سے بڑا خطرہ اردو زبان کو انھیں شعراء سے ہے جو نظم کو نثر کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں چونکہ اردو ادب کی ارتقاء وجلا میں شاعری کی قابل قدر خدمات رہی ہیں شعری سرمایہ کو اگر اردو ادب سے ہم برطرف کردیں تو ادب کی اعلیٰ بیانی خوش بیانی اور رنگین بیانی تقریباً کافور ہو جائیگی نثر یہ پیرائے میں شاعری کا مقصد اردو زبان کا رشتہ شاعری سے منقطع کرنا ہی کہا جاسکتا ہے اسطرح تو اردو کا مکمل عروضی و بلاغتی نظام درہم برہم ہوسکتا ہے عروضی نظام کے زاوئے یوں تبدیل ہونے لگے تو جدیدیت شعری بنیاد کو پاش پاش کرسکتی ہے۔

اردو کے بالمقابل ہندی زبان پہلے سے ہی موجود ہے جو اسکی حریف اور حملہ آوار بھی ثابت ہوسکتی ہے ہندی زبان میں شعری صلاحیت نہ تھی اور نہ ہے یہی وجہ ہے کہ ہندی کی بیشتر نظمیں نثر میں لکھی جاتی ہیں۔ ہندی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری میں نثری میلانات بڑھتے ہی جارہے ہیں جو نثری نظمیں اردو میں لکھی جارہی ہیں ان میں ہندی زبان کے غیر فصیح الفاظ کی بہتایت ہوئی ہے اس بڑھتے ہوئے سیلاب سے ہمارے جدید شعراء خود کو نہ بچا سکے جمال اویسی جو عہد حاضر کے ابھرتے ہوئے فنکار ہیں انکا خیال ہے:-

---

۶۵ ''سیمنار'' ۱۹۸۰ کے اردو نظم عبدالاحد ساز

''میں نے اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں نظم نگاری پر زیادہ توجہ دی اور نثری نظم کی بدعت سے خود کو بچائے رکھا ہے میرے سامنے اردو نظم کی پوری روایت ہے اور میں اقبالؔ کے بعد راشد میرا جیؔ اختر الایمانؔ فیضؔ منیر نیازیؔ ضیاءؔ جالندھری مجیدؔ امجد منیب الرحمٰنؔ شفیقؔ فاطمہ شعریٰؔ وغیرہ کو اہم نظم نگار تسلیم کرتا ہوں۔'' ۶۵ؔ

وہ آگے رقمطراز ہیں :-

''مجموعی طور پر جدید دور میں نظم تو لکھی جا رہی ہے لیکن اسکا رشتہ جدید شعری روایت سے کٹتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے جو اچھی بات نہیں ہے میں پھر کہتا ہوں کہ نثری نظم سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے اور راشد و اختر الایمان کی روایت کو ترقی دیکر عروج تک پہنچانا ہے کیونکہ جدید نظم نے جس تیزی کے ساتھ سفر شروع کیا تھا ایسی ہی بے پروائی کے ساتھ پیچھے چھوٹتی جا رہی ہے ..... زبیر رضویؔ۔ محمد علویؔ ندا فاضلیؔ۔ شہر یارؔ شفیق فاطمہ شعریٰ وغیرہ کے بعد نظم کا کیا ہوگا اس سلسلے میں بھی زبیر رضوی کی طرح غمگین انداز سے سوچتا ہوں اس لئے نظم لکھنے پر زیادہ توجہ دیتا ہوں ۶۶ؔ

۶۶ؔ '' سیمنار'' ۱۹۸۰ کے بعد اردو نظم عبدالاحد ساز

جدید علوم کے حصول اور سائنسی ترقیات نے ہماری طرز زندگی طرزِ احساس طرزِ معاش حتیٰ کہ ہمارے ذہن اور جذباتی رشتوں کو بھی متاثر کیا ہے ان تغیرات نے زندگی کے وہ سارے مفاہیم تبدیل کردئے ہیں جو کئی نسلوں کی دریافت کے بعد ہمیں ملے تھے جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ اس ماحولیاتی فضائی اور معاشرتی تبدیلیوں کے پیش نظر اب ہمارے جدید شعراء و شاعرات کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ماضی کی قدروں کی تلاش کریں اور زندگی کو نئے نئے معنی و مفاہیم سے روشناس کرائیں کیونکہ ہمیں نئی بستیاں بسانی ہیں اپنے جسم و روح کو زندہ رکھنے کیلئے نئے حقائق کی تلاش کرنی ہے۔ جسپر نئی عمارتیں اور نئے ڈیم بنانے کے مقصد میں ہم تبھی کامیاب ہوسکتے ہیں اور انکی پائداری کے ضامن اس صورت میں بن سکتے ہین جب ہمارے نظریات نہایت وسیع ہونگے ادبی منظرنامے کی طرف دیکھیں تو داخلیت سے ماواریت کی جانب پیش قدمی ضروری ہے میری یہ نظم اسی خیال کی عکاس ہے۔

''احساس سے یقین کی طرف\
یہ پیش رفت\
مجھکو مجبور کرتی ہے یہ سوچنے پر

ل ''محور'' تنیم فاطمہ

کیامحور ہے وہ میری زندگی کا
میری سانسوں کی خوشبو
اورآنکھوں کی ساری رمق
ذہن کی دسترس
دل کی دھڑکن کی ساری صدائیں
گردکیوں اسکے پھرتی ہیں ہردم؟
کیاوہ
محور ہے میری زندگی کا'' [۱]

شاعری کے پیرایہ میں ایک لطیف جذبے کا اظہار اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ اپنے مقصد کے گرد حصار ہو اور اسی میں انسان برسرپیکار رہے تو یقیناً کامرانی ملتی ہے اہم اور روزمرّہ کے مسائل پر دلچسپ اور فصیح شاعری ہی اپنے قاریوں کی تعداد میں اضافہ کرسکتی ہے یہ اضافہ اس حدتک ہونا چاہئے کہ لوگ ٹی وی میں دلچسپی لینے کے بجائے ادبی رسائل پڑھنے کی طرف راغب ہوں اظہار بیان کے کون سے سانچے بیکار ہوگئے ہیں اس بات پر غیر جذباتی انداز میں غوروخوض کیا جائے کیا واقعی غزل کی جگہ نظم اور نظم کی جگہ نثری نظم لے چکی ہے اختر ہمیش کا یہ خیال صحیح ہے کہ نثری نظم کا ماخذ سنسکرت کے روپک اور پھر بنگلہ شاعری اور ناٹک کے سنسکرت زدہ مکالمے ہیں؟ کیا آغا کا یہ کہنا مناسب ہے کہ نثری نظم کو 'اصناف شعری سے نہیں' شاعری سے بھی الگ رکھنے کی ضرورت ہے''۔

شعراءحضرات کے ساتھ اردوشاعری کے سنجیدہ قاری کافی متفکر ہیں کہ جدیدیت کے بعداب شاعری کیارخ اختیارکریگی کیامابعد جدیدیت محض اصطلاحی خانہ بندی نہیں کیا موجودہ شاعری نئے افکاراور رجحانات اوراقدار کی بنتی بگڑتی شکلوں کا غیر مشروط اور بے یافت اعتراف ہے؟ یا پھراسے کلاسکس اور روایت کی جانب نیم مراجعت کا نام دیکر مطمئن ہوا جاسکتا ہے؟ یہ ادب

سماجی سروکار سے عبارت ہے یا ٹکنالوجی اور میڈیا کی یلغار اور صارفی اساس اور کلچر کے ساتھ تیر دوڑتی ہوئی فرد کے ذہن و دل کے پرخچے اڑاتی ہوئی زندگی کی ترجمانی ہے؟ یا اس خلفشار اور اضطراب میں کسی یکسوئی اور ارتکاز کی داخلی طلب کا ردِ عمل؟ ان تمام سوالات کے انتشاری کیفیت میں صرف ایک بات پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ شاعری بہرحال شاعر کی زندگی سے شخصی وابستگی کے تخلیقی اظہار کے منصب پر ہی زیب دیتی ہے اور یہیں اپنا جواز بھی رکھتی ہے اس ضمن میں زبیر رضوی کو پیش کیا جا سکتا ہے جنھوں نے جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بھی غیر تجرباتی فیشن ایبل قسم کی شاعری نہیں کی جنکا فن انکی ذات اور معاشرے کے ارتباط و افلاک ہی سے منسوب رہا ''انگلیاں گار اپنی'' زبیر رضوی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے اس مجموعے کی خصوصیات میں بھی گذشتہ مجموعے ''دھوپ کا سائبان'' کی طرح خارج سے ابھرے والے نظریات اور اقدار کے درمیان زندگی کو ایک خاص زاویہ سے دیکھنے اور اسے اپنی سانسوں میں تحلیل کر کے کاغذ پر سجانے کا عمل نمایاں ہے ان کی یہ خوبصورت تخلیق محل بیاں ہے ملاحظہ فرمائیں:-

''شام افکار سے صبحِ اقرار تک
اپنے تیشوں کی شمعیں جلاتے رہے
زندگی شاد ہے،
اسکے لطف و کرم بند ہم پر ہوئے
ہم تھے حرف انا صر مقتل ہوئے
چشم قاتل ہمیں دیکھ لے
ہم تیری تاجداری میں کس بانکپن سے جئے
سر اٹھا کر چلے''[۱]

---

[۱] ''ہم تھے حرف انا'' زبیر رضوی

اسکے برعکس کشمکش زندگی کے اظہار کے دوران بھی جمالیات زندگی ایک مثبت رجائی ہر طرح کی طرح انکی نظموں میں نظر آتی ہے۔

عجیب ہیں یہ ہمارے رشتے
میں چاہتا ہوں
فضا کو بارور کے دھوئیں سے بچائے رکھوں
برسوں؟
آسماں کا جمال یوں ہی بنائے رکھوں
میں سوچتا ہوں گلاب رت میں
ہمارا اب کہ جو سامنا ہو
ہم اپنے ہاتھوں میں گرم جوشی کی دھوپ بھر لیں
سیاہ شب کی ہتھیلوں پر
چراغ رکھ دیں [۱]

زبیر رضوی نے چند جدید شعرا کی طرح کلچر پہ اقداری ورثہ کو ایک جدید پیکر دینے کی کامیاب کوشش کی ہے اپنی زندگی کی تازہ ترین نظمیں شاعر کی زندگی کے توسل سے ایک عام انسانی زندگی کے تخلیقی دھندلکے میں سورج کی شعاعوں کی طرح ہویدا ہونے لگتی ہے ایسی ہی نظمیں اپنے قاریوں کا دائرہ وسیع کرنے میں کامیاب ہیں اسی قبیل کی ایک نظم ''نیا مکان''

''پرانے گھر سے
تمام سامان ساری چیزیں
چہل پہل رونقیں تماشے
وہ ملنے جلنے کے سارے موسم
عزیز رشتے
نئے مکاں میں سمیٹ لائے

---

[۱] ''میں سوچتا ہوں'' [۲] ''نیا مکان'' زبیر رضوی

الاؤ رکھدیگی گھر کی ضرورتوں کے
کسیلی کڑوی رفاقتوں کے۔!

گھریلو زندگی خاص کر نچلے طبقے اور پریشان حالی کی یہ نظم لفظ لفظ تصدیق ہے اس طلخ حقیقت کے درمیان بھی زبیر رضوی نے نظم کی حسن روی کو برقرار رکھا ہے یہ انکا خاص فن ہے۔

زبیر رضوی کے علاوہ بلراج کومل اور شہریار کی نظمیں اس تجربے سے گذر رہی ہیں ان کے بعد جن شعراء نے اپنی انفرادیت کی جانب توجہ دلائی ان میں صلاح الدین پرویز حمید الیاس زاہدہ زیدی شمس الرحمٰن فاروقی علی ظہیر وغیرہ کے نام نمایاں ہیں صادق اور صلاح الدین پرویز کے شعری تجربات کی فہرست کافی طویل ہے دونوں نے اپنا شعری سفر آزاد نظم سے شروع کیا اور ہندی اسالیب سے متاثر ہوئے انھوں نے بیک وقت مختصر اور طویل نظمیں تخلیق کیں یہ نثری ہیں اور آزاد بھی انکی روحانی تصویر میں داخلی سوگواری روحانی اضطراب اور جنسی آسودگی نا آسودگی جیسے جذبات پنہاں ہیں انکی ادائیگی کی زبان بڑی حساس اور اثر انگیز ہے اور قابل دید بھی۔

''نصف لمحوں کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے
خوف کے کواڑ سے جھانک کر
دیکھ لوگے مجھے
اور میں
منھ سے ایک قہقہہ تھوک کر
سوریہ منڈل سے باہر نکل آؤنگا

اس دھرا تل کو کھالونگا
سارے سمندر کو پی جاؤنگا
دیکھتے دیکھتے
آکسیجن میں تبدیل ہو جاؤنگا
پھر خلاؤں کے ساگر میں کھو جاؤنگا''

''عصر حاضر کے بحران سے یوں واقف کراتے ہیں:-
یہ عذابوں کا شہر ہے
یہاں خود کو بچانے کے تمام حربے
بے کار ثابت ہوئے ہیں
جب تم سو رہے ہو گے
کوئی تمھاری ٹانگیں چرالے جائیگا''[۱]

''گھر میں کچھ بھی نہیں تاریک سی خوشبو کے سوا
کچھ جھمکتا ہی نہیں اب خوف کے جگنو کے سوا
دام کہسار میں ڈھونڈا تو نہ نکلا کچھ بھی
برف پر چھڑکی ہوئی خون کی خوشبو کے سوا
اس کا چھپنا تھا کہ آنکھوں میں میری کچھ نہ رہا
سرمئی سبز منور رم آہو کی طرح''[۲]

اسی سلسلے میں بہت سی نظموں میں بلند آہنگی اور خطابت کارفرما ہے۔ صلاح

---

۱ ''ایک نظم'' صلاح الدین پرویز ۲ ''دریائے اجل'' زاہدہ زیدی

الدین پرؔوز نے جولسانی اورحسی تجربات کئے وہ بیحد کامیاب رہے انھیں موجودہ دور کا عادل منصوری بھی کہا جا سکتا ہے انکی نظمون کی فضاء اسلامی تہذیب اور جدید ترین کےنظریات سے وسعت پذیر ہوئی صلاح الدین پرویز تکنیکی نظم وضبط سے اپنی تخلیقات کو ایک جدید پیکر عطا اسی تکنیکی ربط وضبط کا سہارا لیتے ہوئے نھوں نے غالب کے لئے سات نظمیں لکھیں جو جدیدیت کی شاہکار ہیں ۔اسی سلسلے میں وہ تحریر کرتے ہیں ۔

''پچیس سال سے میں غالب کا تعاقب کر ہا رہا تھا لیکن ہر بار
وہ مجھے خوف زدہ کر کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے لیکن
اس بار ۱۹۹۹ء میں ان سے ملاقات ہوگئی میں نے انھیں دوبارہ
جینے کی کوشش کی ہے ....سوچتا ہوں اگر غالب
زندہ ہوتے تو غزلیں کبھی نہ لکھتے نظمیں لکھتے......................
ان کی نظمیں کیا ایسی ہوتیں جیسی میں نے لکھی ہیں ....[۶۷]

غالؔب- ''تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ''

نئے انداز میں

''آندھیاں ہوتی ہیں کیا طوفان کسے کہتے ہیں
پہلے تو مٹی کی ایک ہستی بنا پھر سے پوچھ
بارشیں ہوتی ہیں کیا سیلاب کسے کہتے ہیں
پہلے تو کاغذ کی ایک کشتی بنا پھر مجھ سے پوچھ
پوچھتا کیا ہے بتا اے خواب میرے خیال سے
ٹوٹ جاتی ہیں میری نیندیں تیرے سنگار سے
دیکھکر یہ جذبۂ بے اختیاری مہرباں

---

۶۷ ''تمہید'' غالب کیلئے سات نظمیں صلاح الدین پرویز

سر سے پا تک آتش خاموش ہو جاتا ہوں میں

نیند میں رہتا ہوں میں

آغوش ہو جاتا ہوں میں''

غالب- ''ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے،

سست موج کا ساحل اور اک اماوس شب

دیکھ کر نہ ہو غمگین میرے دل میرے بھائی

باولا نہیں کوئی تیرا میرا سنگائی

اسکے ساتھ تو جگ کر

اسکے ساتھ میں جگ کر

دونوں اک کاغذ پر ناخنوں کے کاغذ پر

ایسی نظم لکھیں گے

جتنی ہیں بنات النعش اپنے اپنے گردوں میں

عریاں ہوتی جائیگی اور پھر گھٹا سی اک

استعارۂ آغوش 'عطر چتر متراں سی

دل کہاں کہ گم کیجئے! دل کہاں کہ گم کیجئے!

یوں صدا لگائے گی''

اسی طرح پرویز کا یہ نہایت جدید تکنیکی تجربہ غالب کی پانچ اور غزلوں پر کامیاب بھی رہا۔

'آج ادھر کو ہی رہے گا دیدۂ اختر کھلا'

'بارے آرام سے ہیں اہل وفا میرے بعد'

'زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال'

'پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں'

'دیکھنا حالت میرے دل کی ہم آغوشی کے وقت'

ادب میں تغیر وتبدل کا سلسلہ بلاشبہ رگوں میں گردش کرنے والے تازہ لہو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور تبدیلیوں کا یہ سلسلہ یقیناً تجربات کے ذریعہ سے فروغ پاتا ہے جو اپنے رویوں میں اجتہادی ہونے کے باوجود کہیں نا کہیں اپنی روایت کے خمیر سے گندھے ہوئے تھے یعنی وہ تجربات جنکی بنیادی سطح اپنی تہذیب میں پیوست تھین انھیں نہ صرف اپنے مقصد میں خالرخواہ کامیابی ملی بلکہ شائقین ادب کا ایک کثیر حلقہ بھی انکی حمایت میں ہے جدید شاعری میں نثری نظم کے حوالے سے اگر ہم غور کریں تو کئی سوالات ہمارے سامنے ہونگے جو اکثر ذہن کے نہاں خانے میں ڈوبتے ابھرتے رہے ہیں اور جنھیں نظرانداز کیا ہی نہیں جا سکتا ان سوالات کی پیچیدگیوں نے دراصل ایک کلیدی سوال کو ہی محصور کر رکھا ہے وہ سوال یہ ہے کہ کیا نثری نظم کا اپنا کوئی وجود ہے یا پھر نادیدہ دانستہ تخلیق کاروں کا ایک کارواں اپنی دھن میں مگن ایک انجانی منزل کی جانب گامزن ہے۔

جہاں تک نثری نظم کے علیٰحدہ وجود کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہزاروں کوششوں کے باوجود اسکا علیٰحدہ تصور نہیں کیا جاسکتا نثری نظم کے مبلغین اسے نثر کے خانے میں رکھنا چاہتے ہیں جبکہ شاعری کی سرحدوں میں اسکا داخلہ تکنیکی اعتبار سے ممنوع ہے یہی وجہ ہے کہ

ہیئت کے دو پاٹون میں نثری نظم مسلسل پس رہی ہے۔ خدشہ اسی بات کا ہے کہ اسطرح دوز بانوں کی زد میں اسکا وجود کہیں معدوم نہ ہو جائے نثری نظم کی حمایت میں بلند ہونے والی آوازوں کو اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اور اسی مزاج کے اعتبار سے اسکا میعار متعین کیا جاتا ہے جب تک جدید تجربات اسکے مزاج سے امتزاج کرتے ہیں وہ مقبولیت کی سند حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن جب کبھی اس مخصوص زبان وادب کی مخالفت کی جاتی ہے تو تجربے ناکام ہوکر عہد پارینہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

بلا شبہ کہا جاسکتا ہے کہ نثری نظم نے اردو شاعری کے مزاج اور میعار پر کاری ضرب لگائی ہے اور اس شعری حسن کو مسخ کر دیا ہے جسکی بنا پر اسکو مقبولیت کی سند مل سکتی تھی۔

منظوم تخلیق کو ہم نظم اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب اسمیں نغمگی کی کیفیت ہو ترنم کا احساس ہو خیالات کی وارفتگی ذہنوں کو محو کر دے ان کیفیات وموضوعات کے متعلق بعض نظموں میں قدرے مختلف فضاء دیکھنے کو ملتی ہے اور ایک خاص قسم کا آہنگ اور خیالات کا فطری رویہ قدر مشترک طور پر موجود ہے۔

جدیدیت کے حامیوں میں کچھ شعراء نظم معریٰ اور نثری نظم کے نام سے قابل اعتناء تخلیق کر رہے اور خود کو شاعر کہلانے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں دراصل وہ خو کو دھوکہ دے رہے ہیں تساہلی اور سہل پسندی انکا مزاج بن چکی ہے نثری نظم کو یا تو کمزور شعراء اپنی شناخت کا وسیلہ بنانے کی ناکام کوشش کی یا پھر حاشیہ کے افسانے نگاروں کے کئی صفحے پر مشتمل کہانی لکھنے کے بجائے کہانی کے بعض حصوں کو چھوٹی بڑی لائنوں میں سجا کر جدید نظم کا پیکر دے دیا اسطرح لا تعداد نام نہاد نظمیں وجود میں آ گئیں اور متعدد رسالوں میں پابندی کے ساتھ شائع ہونے لگیں جب نسبتاً محنت کم اور خاطر خواہ نتیجہ سامنے آنے لگا تو پھر خواہ مخواہ مشقت کے جھمیلوں میں پڑنے کی بھول کون کرتا ظاہر ہے ایسی صورت میں نثری نظم کو برگ وبار بننا ہی تھا لیکن کسی بھی دور میں شاعری کی بنیادی اقدار سے سمجھوتا نہیں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ آزاد نظم نے ادب کی تاریخ میں

حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا یہ ایک ایسا کارگر نسخہ تھا جسکی بدولت شعراء حضرات کو اظہار خیال میں آزادی کے تمامتر وسائل دستیاب تھے اآزاد نظم کا تجربہ اسوجہ سے بھی کامیاب ثابت ہوا کیونکہ اسمیں کسی نہ کسی طرح شعری اقدار کی پاسداری قائم تھی اور نظم جس تسلسل آہنگ موسیقیت اور نغمگی کا تقاضہ کرتی ہے وہ ساری خصوصیت آزاد نظم کے پیرایہ میں موجود تھی میرے خیال سے نظم جدید تجربات کے زمرے میں وہ آخری سرحد ہے جسکے رو یہ میں اردو شاعری کے متعدد اور توانا روایات کے اہم اجزاء شامل ہیں آزادی فکر کے نام پر آزاد نظم کے بعد کسی اور تجربے کو مقبولیت کی سند حاصل نہیں ہو سکتی باقر مہدی کی ایک نظم کی چند لائنیں ملاحضہ ہوں:-

''کون ہم سب کو قیامت کے قریں لایا ہے
ہر طرف جنگ کا چرچہ ہے
سارے اخباروں کی سرخی ہے یہی
ایٹمی دور ہے یہ
حکمراں ناز دکھاتے ہیں کہ پھر انکا زمانہ آیا
جشن میں نان جویں بھی نہیں ہوتی تقسیم
صرف گھنٹوں کی صدا آتی ہے'' [۱]

''یہ مانا کہ ایک ویران صحرا بر باد ہوں
مجھکو بر باد رہنے دو
مری طرف یوں عنایت کی چشم ریا سے مت دیکھو
مجھے اب بھی اس زہر کا ذائقہ یاد ہے
جسکو تم نے بڑی نرم سی مسکراہٹ کے ساغر میں
حل کر کے مجھ کو دیا تھا'' [۲]

---

[۱] ''ایک کالی نظم'' باقر مہدی کالے کاغذ کی نظمیں [۲] ''خیر طلب'' مظہر امام

باقر مہدیؔ اور مظہر امامؔ کی یہ نظم ازلی فکر کے ساتھ نظم کے تمام محاسن سے مسجع ہیں جو انھیں از راہِ مقبولیت لے جاتے ہیں زبان و ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہیں کہ کسی بھی زبان میں بڑا ادب شاعری کے معینہ معیار کے پیش نظر ہی تخلیق کیا گیا اور موجود سائنسی عہد میں بھی قابل قدر شعری اقدار ہی میعار کا اصل پیمانہ قرار پائینگے جب انکی تخلیق سے شاعری میں کوئی بے ضابطگی پیدا نہیں ہوگی تو آج ہمنے سہل پسندی اور تساہلی کو کیوں مسلط کرلیا ؟ نئے نئے تجربات کے زعم میں ہم اپنی مضبوط اور توانا روایتوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اپنی جڑوں سے کٹتے جا رہے ہیں ایسی صورت میں شعرا و ادب کی شاخوں پر برگ و باری کا عمل کیسے جاری رہ سکتا ہے؟

ایک شاعر اپنی مخصوص منطق سے اور ایک منفرد ذہنی جذباتی اور تہذیبی فضاء میں ایک روشن اور مثالی تصویر پیش کرسکتا ہے ایسا واضح تصور جسمیں سیاسی اقتصادی اور معاشرتی قدر منتشر کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہو۔ زوال پذیر اقدار کے سبب روحانی خسارے کے احساس سے بوجھل ہونے کے باوجود بھی جدید فنکار احساس ہلاکت سے محفوظ نظر آتا ہے اور اپنے ادراک کا دفاع بڑی مہارت کے ساتھ دلکش لب و لہجہ خوبصورت اسالیب بیان علائم و استعارے و تاریخی حوالے کے ساتھ سادہ مگر سیال سطح پر قائم رہتے ہوئے اپنی دور بینی کا ثبوت دیتا ہے۔

''عجب ہے اس برس کا موسم
نہ دھوپ جیسا
نہ چھاؤں جیسا
نہ چشم بیدار ہم نشینو!
نہ خواب دم ساز دل فروزاں

---

۱ ''اس برس کا موسم'' امین اشرف

کہ شہر پر ہول کی فضائیں
عداوتوں کے دھوئیں میں اٹ کر
کثیف شعلے اگل رہی ہیں
گلابی موسم کے خواب تاریک ہو چلے ہیں
اداسیاں مجھ پہ ہنس رہی ہیں'' [1]

''امید صبح!
مری رات میں بدلتی ہوئی
میں اک ماندہ مسافر
خیال وخواب لئے تیری تلاش میں نکلا
جواب بھی
جاری ہے [2]

ان نظموں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امین اشرف نے اپنے جذبات کو روح اندر ربسا کر انھیں حرف وصوت کی انوکھی تنظیم کی وساطت سے آشکارا کرنے کی سعیٔ کامیاب کی ہے۔

''زندگی رات نہیں
صبح ازل ہے یارو
تم بھی تھک جاؤ
تو اس راہ میں دم لے لینا
اور میری ہی طرح دن کا اجالے کر
اپنی تصویر کو عریاں کر کے
اسمیں رنگین خیالوں کو منور کرنا

---

[1] ''تلاش '' [2] امین اشرف جادۂ شب ص ۱۲۹-۱۲۸

اپنے سوئے ہوئے جذبات
میں حدت لاکر
اپنے احساس سفر کو
یوں ہی جاری رکھنا'' [۲]

احساس سفر کو جاری رکھنے میں امین اشرف نے اپنے جذبات اظہار میں جس حزم احتیاط نرمی اور سبک روئی کو پیش نظر رکھا وہ ایک ایجابی پہلو ہے اسمیں مشاہدے اور روحانی مدرکات کی لطافت اور متضاد وسیلے سے حقیقت کا تعین کیا ہے۔

جدید شاعری کا مجموعی مزاج مع جمالیات اقتضاءِ جدیدیت کے ساتھ سیاسی اقتصادی اور معاشرتی لیاقت میں صورت پذیر ہوا ہے۔ سیاست کا لفظ ذہن میں آتے ہی اک ایسی اصطلاح سامنے آتی ہے جسمیں تمام تر فتنہ انگیزیاں ہیں اسکی وضاحت میں منور رعنا کا ایک شعر ہی کافی ہوگا۔

خدا محفوظ رکھے ملک کو گندی سیاست سے
شرابی دیوروں کے بیچ میں بھوجائی رہتی ہے

ایک باشعور اور حساس ذہن اس شعر کے ذریعہ حالیہ سیاسی آلودگیوں کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے میری حجت تو نظم سے ہے مگر اس اک شعر کے توسل سے نہ جانے کتنے ایسے ہی اشعار میرے ذہن کے کینوس پر ابھر رہے ہیں۔ دور حاضر کے بدلتے رجحانات، متفرق موضوعات تغیر پزیر افکار و نظریات، نے عام شعراء اور قلمکاروں کو بھی متاثر کیا ہے، دوران مطالعہ ایسے تجربات سے گذرنا پڑا جو بیحد متحیر آفریں اور نتیجہ خیز تھا، مثال کے طور راحت اندوری کا نام عام شعراء کی فہرست میں شمار کیا جاسکتا ہے جنہوں نے بعض ایسے سیاسی نکات کو پیش کیا ہے جو

---

[۱] '' گوپی چند نورنگ کے حوالے سے''

بغیر نئی تھیوری کو پڑھے' کوئی دوسرا پیش نہیں کرسکتا۔ ان کے اشعار محض تجربہ کے لئے پیش مطالعہ ہیں انھوں نے سیاست کی وضاحت بہت ہی بیباکانہ انداز میں کی ہے جو مخل بیان ہے۔

''جدھر سے گذرو دھواں بچھادو
جہاں بھی پہنچو کمال کردو
تمہیں سیاست نے حق دیا ہے
ہری زمینوں کو لال کردو
وکیل بھی تم اپیل بھی تم
گواہ بھی تم دلیل بھی تم
جسے بھی چاہو حرام کہہ دو
جسے بھی چاہو حلال کہہ دو''

ایک اور مقام پر سنسد بھون کی تعریف میں چند مصرعے

''ہم ایک ہوتے تو سب کچھ اتھل پتھل ہوتا
جو اپنے منھ سے نکلتا وہی اٹل ہوتا
تمھارے دور میں سنسد بھون ہے جسکا نام
ہمارے دور میں ہوتا تو اصطبل ہوتا''

سنسد بھون کی اس منظر کشی پر راحت صاحب سے کسی نے اعتراض کیا کہ آپ نے سنسد بھون کی توہین کی ہے انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ میں نے سنسد بھون کی توہین نہیں ہاں اصطبل کی توہین ضرور کی ہے کیونکہ اصطبل میں تو اعلیٰ قسم کے گھوڑے رہتے ہیں مگر سنسد

بھون میں گدھے اور خچر ہوتے ہیں راحت اندوری کے اس خیال سے ہمیں بھی متفق ہونا پڑتا ہے کیونکہ سیاست کا گرتا ہوا معیار شعراء کو کافی مواد فراہم کر رہا ہے جعل سازی اور فتنہ انگزی کا کوئی سامان ایسا نہ ہوگا جو انکے یہاں دستیاب نہ ہو۔

''اندھیرے چاروں طرف سائیں سائیں کرنے لگے
چراغ ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرنے لگے
سلیقہ جنکو سکھایا تھا ہمنے چلنے کا
وہ لوگ آج ہمیں دائیں بائیں کرنے لگے
لہولہان پڑا تھا زمیں پہ اک سورج
پرندے اپنے پروں سے ہوائیں کرنے لگے
عجیب رنگ تھا محفل کا خوب مجلس تھی
سفید پوش اٹھے، کائیں کائیں کرنے لگے''

آج معاشرے میں جن آلودگیوں نے فضا کو پراگندہ کر رکھا ہے انمیں بیشتر کردگی سیاسی بازی گروں کی ہے یہ درہم برہم نظام چیخ چیخ کر سیاست کے خلاف آوازیں بلند کر رہا ہے۔ پرویز شاہد کی ایک نظم اسی ضمن میں :-

''یہ ریزہ ریزہ آدمی
یہ پارہ پارہ آدمی
ہزار چہرہ آدمی
معاشیات و حرص کا ابھرتا خلفشار ہے
مجسم انتشار ہے

---

[۱] ''بے چہرگی'' پرویز شاہد

نظام بے مہار کا عظیم شاہکار ہے
ہزار چہرہ آدمی
خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا
رواں دواں
ابھی یہاں
ابھی وہاں'' [1]

مذاق اردو میں ہر چند مابعد جدیدیت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے جسکے اثرات شاعری میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں لیکن ہم ٹھہرے روایت پرست جس طرح ترقی پسند مزاج نے جدیدیت کو قبول کرنے میں سست روی دکھائی وہی رفتار جدیدیت کی مابعد جدیدیت کی جانب ہے چونکہ ہم حق تلفیوں کا شکار ہیں یہی وجہ ہے کہ نئے خیالات سمجھنے پرکھنے اور اردو کے تناظر میں انکی مقبولیت کو بروئے کار لانے میں سست رو بھی ہیں۔

عصر حاضر جدیدیت کا دلدادہ ہے یہ ہر شعبہ میں جدید سے جدید ترین کی جانب گامزن ہے جسمیں اردو ادب اپنا ایک متعین مقام رکھتا ہے تقریباً تیس سال کے عرصہ میں ہمارے ادبی سرمایہ میں جو جدیدیت کا رجحان بڑھا اسمیں اردو نظم پیش پیش رہی یہ اپنا امتیاز و وقار بنانے میں کہاں تک کامیاب رہی اور اسکی کامیابی کا معیار کیا ہوگا زیر بحث لانا اس مقالے کا ایک توانا پہلو ہے۔

جدیدیت جسنے ہمارے شعراء کو اجنبیت یاسیت اور احساس جرم میں گرفتار کر رکھا تھا جدید ترین نسل کے شعراء اب اس حد سے بڑھتی ہوئی داخلیت شکست ذات اور لایعنیت سے اوب چکے ہیں اور اس حصار سے باہر نکل کر کھلی فضاء میں سانس لینا اور زندگی کے نئے مسائل سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں تغیر زندگی کی علامت ہے۔ شاعری میں یہ تغیر جدید نظریات و افکار ہی لا سکتے ہیں اور یہ حوصلہ ایک تخلیق کار ہی کر سکتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں جدید شعراء کے نئے نئے تجربات اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کے پیش نظر ہمیں اردو نظم کی ارتقاء پر شائبہ سا ہونے لگا ہے اسکی ارتقاء کی سست رفتاری ہمیں غور کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ کیا یہ ترقی کی میعاری بلندی تک پہنچ سکے گی؟ زیادہ تر نظم گوشعراء نظم سے کنارہ کش ہوکر غزل کی پناہ لے رہے ہیں گذشتہ برسوں میں نظم گو شعراء نظم میں کافی دلچسپی لیتے رہے لیکن انکا یہ رجحان رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور انکی تعداد میں خاصی کمی ہوگئی اسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نظم میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنا کافی دشوار کن ہے اس سے بیشتر شعراء غزل گوئی کی جانب مائل رہے ہیں اور نظم گوشعراء کے مقابلے میں اکثر غزل گوشعراء اپنی انفرادیت بھی منوا چکے ہیں۔

عصر حاضرہ کے ادبی سرمایہ کا اگر ہم تجزیہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں ۸۰ء کے بعد بھی جدید شعراء نے زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں حال ہی میں ندافاضلی کو ''ساہتیہ اکیڈمی ایورڈ'' سے نوازا گیا ہے اور بیشتر شعراء کی لاتعداد نظمیں شائع ہورہی ہیں شعراء کا یہ شعری سفر مسلسل جاری ہے اور نہایت ہموار اور منضبط بھی ہے جدید شعراء کی تخلیقات اردو کے شعری ادب میں فنی تجربے اور بڑھتی حد تک فکر کے لحاظ سے بھی ایک قابل قدر اضافہ کررہی ہیں۔ بلراج کومل اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:-

''یہ بات یقینی طور پر طے ہے کہ جدید نظم اپنا ایک منفرد اور مثبت وجود رکھتی ہے اور حصول اور کامیابی کی بہت سی منزلوں سے گذر چکی ہے'' ۶۸

جدید نظم کا اہم ترین پہلو اسکا خوبصورت مزاج ہے آج کی نظم کی داخلی نغمگی اسکے خارجی وسائل کی اسدرمرہون منت نہیں جتنی کہ بیسویں صدی میں ہوا کرتی تھی۔ جدیدیت کو اپنے آپ پر بھرپور بھروسہ ہے اس خیال کے پیچھے یہ نفسیات ہے کہ ہم سب

---

۶۸ ''جدید نظم کے امکان وآفاق'' بلراج کومل اردو نظم ۶۰ء کے بعد ص ۷۰

دوسروں سے الگ ہوتے جارہے ہیں آجکا شاعر گویا ایک Private person ہے جسکی تخلیق صرف اپنی ذات کیلئے ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ اردو کی صدیوں پرانی روایت سے انحراف ہے جس نے زندگی میں بے چینیوں اور بے ربطیوں کو پیدا کیا ہے۔

آج کی شاعری کا ماضی سے انحراف اسکے لہجے میں ملتا ہے، زبان وبیان میں بہت سے جدید نظم نگاروں کے انداز کو غرابت بلکہ کھردراپن کہیں گے جو آج کے شاعر کے نقطۂ نظر کی خامی نہیں بلکہ فن ہے جسے اقتضاء وقت نے بخشا ہے جو حلقۂ تغیرات سے گذرتا ہوا خود ایک اعلیٰ میعار پر سند کی مہر لگانا چاہتا ہے۔ جسے ہم عام زبان میں میعار پرستی سے انحراف بھلے ہی کہہ لیں مگر شاعری کا خصوص ذوق رکھنے والے یہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ عام طور پر مشتمل زبان اور جدید شاعری کی زبان کے یہ فاصلے اب بتدریج کم ہوتے جارہے ہیں۔ آج کا شاعر لفظی معنی کی بحثوں سے بالکل آزاد ہے اب معنی آفرینی کی جگہ فضا آفرینی لیتی جارہی ہے۔

''یہ اسالیب بیاں
میری جاں
کیوں کئے ایجاد میرے واسطے
خامشی کچھ کم نہ تھی
تیری پلکیں تیرے لب اور تیرے گیسو چوم کر
کیا میں نے تیرے دل سے کہا؟
کیا میں نے تیرے دل سے سنا؟
قرب کے شفاف نکھرے آئینے میں آج تک
دن نکلتا دن رہا
رات ڈھلتی رات تھی
ہم بھی پابندیٔ اظہار کے قائل نہ تھے

---

۱ ''رشتۂ دل'' بلراج کومل

یہ ہجوم لفظ و معنی یہ اسالیب بیاں
میری جاں
کیوں کیا ایجاد تو نے آج میرے واسطے'' [۱]

''کورا کاغذ
الماری میں بند پڑا تھا
شیشے سے باہر کمرے میں
بند دوات قلم تصویریں
دیکھ کہ میں یہ سوچ رہا ہوں
کاش کبھی ایسا ہو جائے
میز اچھل کر الماری سے ٹکرا جائے
کورا کاغذ گیلا کر دے'' [۱]

''چائے کی پیالی سے ابھری
وہ سنہری شام
ہنستی آنکھوں سے اڑے رنگ برنگے جگنو
سانس کی ببل پر الفاظ کی بوندیں ٹپکیں
اک انجانی سی خوشبو پھیلی
میری سگریٹ کا دھواں
اسکے رخساروں کو چھو کر گذرا
بجلیاں ٹوٹ پڑیں

---

[۱] ''پیاس'' علی اصغر [۲] ''ایک سنہری شام'' باقر مہدی

وہ میرے محبوبہ نہ بن جائے کہیں
میں نے یہ سوچ کے اسکا کوئی بوسہ نہ لیا
اسکی پرکیف ہنسی
ایک دھنک بنکے فضاء میں پھیلی
ہم بہت خوش تھے
دل میں آنکھوں سے اتر آئی تھی
سنہری سی شام'' ۲؎

یہ تینوں نظمیں خاص روائتی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں مصرعوں اور الفاظ کے دروبست کا رشتہ نظم کے مکمل آہنگ کو ایک اکائی کی شکل میں پیش کر کے ایک ایسی فضاء تشکیل کرتا ہے جو نہایت سحر انگیز اور قابل توجہ ہے اب نظم کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے سارے زاویے بدل چکے ہیں نظم کو سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی اس سے حاصل ہونے والا سکون واضطراب ہی اپنے اندر تسلی بخش مفہوم رکھتا ہے نظم اگر قاری کے مزاج ومیعار پر پوری اترے تو کامیاب ورنہ ناکام ثابت ہوتی ہے۔

'' مجھے ڈر ہے کہ کہیں چند سال بعد ہم اچھی نظموں کیلئے ترس کر نہ رہ جائیں حالانکہ اردو شاعری کو اگر آگے بڑھانا ہے تو ہمیں نظم کے امکانات کا جائزہ لینا ہے۔'' ۶۹؎

نظم جب تک، عام فہم لوگوں کی تہذیب کا مزاج نہ بن جائے عظمت سے محروم ہی رہتی ہے خصوصاً وہ شاعری جو ماضی سے انحراف کرے' جدید تہذیب کی ضامن تو ہوسکتی ہے لیکن یہ لطیف احساس جذبے اور تجربے کی ضامن کبھی نہیں ہوسکتی۔ اسے یاد نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ

۶۹؎ ''ایک جائزہ'' خورشید الاسلام

اپنے احساس سے ہی پائندہ رہتی ہے۔

نئی لسانی تشکیلات نیز مختلف تزئین شعری اور تکنیکی تجربوں کے لحاظ سے جدید شعراء میں عادل منصوری بھی قابل ذکر حیثیت رکھتے ہیں وہ زبان وبیان کی زیادہ سے زیادہ آزادیوں برتتے ہس اسلئے انکی اکثر نظمیں لسانی تجربات سے گذرتی ہیں وہ اک طرف قدیم روایت سے وابستگی کا دم بھرتے ہیں تو دوسری جانب جنسی علائم جنسی جذبات اور احساسات کو بھی بلا تامل پیش کر دیتے ہیں دراصل انکے لسانی ہئیت کے تجربوں سے ہی آج کے بہترین شعراء کے تخلیقی شعور کی نمائندگی ہوتی ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں جدید شعراء نے زبان وبیان کی نئی سمتوں کی تلاش ویافت کی جانب شعوری توجہ دی ہے انکی کاوشوں کے سبب شعری ہئیت لفظیات امیجری وڈکشن وغیرہ میں قابل قدر تجربے ہوتے رہے ہیں بالخصوص علامتوں اور امیجز کا آزادانہ استعمال ہی شعری زبان کا اہم جز رہا ہے ان اجزاء کو بروے کار لانے میں نئے شعراء نے صرف دلچسپی ہی نہ لی ہے بلکہ اپنی نظموں میں اسے کامیابی سے پیش بھی کیا ہے انھیں علامات وامیجز کا نتیجہ ہے کہ اب شاعری میں سپاٹ بیہمانہ انداز اور منطق توضیحات کے بدلے اشاریت اور رمزیت جیسی خصوصیت ملتی ہے انسانی زندگی کی روز افزوں مادی اور روحانی پیچیدگیوں نے نئے شعراء کیلئے تقریباً یہ محال کر دیا ہے کہ وہ ایک خاص زبان میں شاعری کر سکیں جو دراصل مخصوص عقائد کی قبولیت کا نتیجہ ہوتی ہے بالسبب آج شاعر انفرادی طور پر نئے استعارے نئی علامتوں کی تخلیق کرنا چاہتا ہے یا انھیں عناصر کے ردوبدل سے ازسرنو تشکیل پر ہی اسے مطمئین ہونا پڑتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسالیب اور مضامین میں تنوع ہی نئی شاعری کی وہ بنیاد ہے جو اسے ممتاز ومنفرد بنا سکتی ہے۔

شعری اسلایب میں انتہاپسندانہ جدیدیت کی نمائندگی احمد ہمیش عادل منصوری، شفیق فاطمہ شعریٰ ۔ وغیرہ کر سکتے ہیں اور اعتدال پسندانہ جدیدیت کی نمائندہ شعراء

باقر مہدیؔ وزیر آغا ۔ قاضی سلیم شاذ تمکنتؔ بلراج کوملؔ، بشر نواز ، ندا فاضلیؔ ساقی فاروقیؔ کمار پاشیؔ عمیق حنفی زاہد ڈارؔ شہاب جعفریؔ محمد علویؔ شہریارؔ بمل کرشن اشک یوسف ظفر زاہدہ زیدیؔ وغیرہ ہیں۔

ان میں کوئی شاعر کسی کا مقلد نہیں ہے بلکہ سبھی اپنا منفرد اسلوب رکھتے ہیں ان میں جنکا زبان ولہجہ زیادہ موثر رہا وہ برابر تخلیقات میں اضافہ کرتے رہے ہیں اور جنکو ابھی اس فن میں مہارت حاصل نہیں ہوسکی وہ اخلاصانہ جذبے کے ساتھ اپنی راہ متعین کرنے کی جہد مسلسل کررہے ہیں یہ حضرات زبان کو لغوی اور نحوی تحدید سے آزاد کرانا چاہتے ہیں یہ عام طور پر اپنی نظموں میں ایسی علامات کو استعمال کرتے ہیں جو انکے نجی پیچیدہ اور ذاتی تجربات کا نتیجہ ہوتی ہیں منتشر احساسات کو بخوبی زبان دینے کا واحد ذریعہ علامت ہی ہوتی ہیں جسکا فائدہ جدید شاعر خوب حاصل کررہا ہے۔

تین دہائیوں کے سفر سے چوتھے تک جدید نظم کی کامیاب اور ناکام مثالوں کی شناخت کسی حد تک ہوچکی ہے کچھ شعراء محروم حیات ہوگئے کچھ اب بھی سرگرم سفر ہیں بشر نوازؔ وزیر آغا زبیر رضویؔ شہریارؔ قاضی سلیم محمد علویؔ وغیرہ کی تخلیقات انکی کامیابی کے ثبوت فراہم کرارہی ہیں ان میں زندگی کے عام تجربات سے وابستہ روزمرہ کی تمام چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا ذکر کسی منصوبہ بند حال ماضی یا مستقبل سے پابستہ نہیں ہے۔ اسکے باوجود اس دور میں بیشتر ادبی رسائل کے صفحات اور شعری مجموعے کی صورت میں جو تازہ ترین نظمیں آرہی ہیں ان میں اکثر تعداد تخلیقی تیور سے محروم منتشر تفصیلات کا مجموعہ ہیں چند مثالیں:۔

"اکیلے پن کے خوف

اور ساتھ کے دکھ

کے بیچ

زندگی گذارنے کی صورت حال

اور رننگ دوڑ کے لائحہ عمل میں کسا ہوا

وہ ایسا آدمی ہے

جسکے اندر باہر

خود بخود ٹوٹنے اور بکھرنے کی

سمتیں موجود ہیں

مختصر ہے اپنی تفصیل حیات

ایک تاریخ تولد

ایک تاریخ وفات''

''کئی سگریٹ ہیں جن سے

موسموں کی راکھ جھڑتی ہے

کئی دن ہو گئے اس راکھ سے

خواہش کی چنگاری اڑے

کتنے برس گذرے ہیں

اس دھرتی پر کوئی چاند نکلا ہو

افق تاریک میں

سہمے پرندوں کی طرح خاموش ہیں سارے

مگر ان سوتی جاگتی نیم خوابیدہ خوراک میں

مقید ہیں''

یہ مثالیں نفس لامرکزیت کے اظہار سے بہتر ہونے کے باوجود ہر قسم کے فنی

حصول سے ناکام ہیں اکثر نظمیں جو نظم جدید کے نام پر شائع ہو رہی ہیں انفرادی شخصت سے عاری نظر آتی ہیں دور حاضر میں جو شاعر اپنی شناخت مستحکم کر چکے ہیں ان میں حمید الیاس، محمد علوی، قاضی سلیم، باقر مہدی، شہریار، زاہد زیدی، ساجدہ زیدی، وزیر آغا، زبیر رضوی، منیر نیازی، امجد اسلام، محمود سعیدی، کشور ناہید، خوشگوار وقفوں میں اپنی تخلیقات بطور ثبوت پیش کرتے رہے ہیں کچھ نئے نام بھی منظر عام پر ابھر رہے ہیں جس میں ہندوستان و پاکستان کے دیگر شعراء بھی شامل ہیں مذکورہ شعراء کی اکثر و بیشتر نظموں کی ساخت میں جدید شعراء کا ثفاعل موجزن ہے ان شعراء کو میں ان کی مخصوص نظموں کے ساتھ تحریر فہرست کروں یہ ایک غیر ضروری عمل ہے پھر بھی جدید شعراء کی بالاطرفی اور مذید ثبوت کیلئے ان نظموں کا مطالعہ ضروری ہے۔

مجید امجد، (آٹو گراف ۔توسیع ۔شہر ۔دوام)

کمار پاشی (بوڑھی کہانی ۔جنم دن ۔گندے دنوں کا قصہ ۔گواہی کون دے گا تیری مخلوق تجھ سے مخالف ہے ۔سفید پھول ۔نیم سرگوشی کا منظر)

خلیل الرحمن، اعظمی (میں گوتم نہیں ہوں ۔ لمحے کی موت)
(کاغذ کی ناؤ ۔سرکس کا گھوڑا ۔ایمبولینس)

باقر مہدی، (ریت اور درد ۔شام ۔ایک دوپہر ۔لفظ بیکار ہیں ۔سرگوشی ۔میری آواز)

وزیر آغا، (ڈھلان ۔بانجھ ۔ کوہ ندا)

ساقی فاروقی (امانت۔شیر امداد علی کا مینڈک۔مردہ خانہ شاہ صاحب اینڈ سنٹر)

شہریار (قریب در قریب۔سائے کی جوت۔رات کی زد سے بھاگتا ہوا دن (بات کے سمندر کے اس طرف۔ایک عجیب خواہش،اپنے سے دوری اور دیکھتے ہم بھی)

بلراج کومل (واپسی۔جب اکیلی راتوں میں)

منیب الرحمن (آہستہ۔باز دید۔سنہالی ناچ
کشور ناہید (گھاس تو مجھ جیسی ہے۔حضرت نوح کے زمانے کی کہانی۔دھواں چھوڑتی بسیں)
یوسف ظفر (وادیٔ نیل)

قیوم نظر (اکیلا)

افتخار جالب (دھند۔تہنائی کا چہرہ)

قاضی سلیم (بے ثمر۔کھلونے۔وائرس۔پرواز)

مظہر امام (رشتہ گونگے سفر کا۔اکھڑے خیموں کا درد۔آنگن میں ایک شام)

زاہد ڈار (زوال کا دن)

شاذ تمکنت (آنچ کا خون بہا۔ ماوریٰ، آب و گل۔ رائیگاں)

محمد ایاز (مشت خاک۔ شب چراغ۔ اسپتال کا کمرہ)

صلاح الدین پرویز (سمندر آرا۔ کنفیشن سیریز)

انیس ناگی (خاموشی کا شہر)

افتخار عارف (بارہواں کھلاڑی)

عمیق حنفی (بھیروی۔ جنگل۔ آئینہ خانہ کے قیدی۔ پیران طریقت)

فہمیدہ ریاض (لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ)

پروین شاکر (کسے کہ کشتہ نہ شد۔ سرشاری)

شمس الرحمٰن فاروقی (گنج سوختہ۔ سبز اندر سبز) (تیشۂ ساعت کا غبار)

زبیر رضوی (بنی عمراں کے بیٹے۔ خطائے بزرگاں۔ امیر شہر کی نیکی)

غرضکہ کہاں تک حوالے دیئے جائیں جدید نظموں کا ہستئی قالب خواہ کچھ بھی ہوا کثر و بیشتر نظموں میں بیانیہ جو ہر تحلیل ہوگیا ہے یہ بات اور ہے کہ ایک تعداد ان شعراء کے یہاں ایسی نظموں کی بھی ہے کہ ان میں واقعاتی نظام برائے نام اور یکسر معدوم ہے یا محض تخیل کی کارگذاری اکثر مقامات پر تجریدیت اور پیکریت کی شکل میں محض تصور اور تصویر تک محدود ہے حالانکہ ان نظموں میں شعر کے سارے عنصر موجود ہیں پھر بھی جب ہم جدید نظم کے مستقبل اور اسمیں ہونے والے امکانات کے جائزے کے مدنظر پچھلے تیس سالوں کی تخلیق شدہ نظموں کے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ جدید نظمیں تو بہ نو بانو فارمولوں کی وساطت سے سرگرم سفر ہیں لیکن عملی حصول کی سطح پر فیصلہ کن انداز اور کامیاب مثالوں سے محروم ہوتی جارہی ہے نظمیں تو لکھی جارہی ہیں لیکن غزل کی فراوانی اب بھی حاوی ہے ہندوستان پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل وکتب کے مطالعے اور ادبی جلسوں مذاکروں اور محفلوں کے توسل سے جدید نظم کے مستقبل کا جو منظر نامہ مرتب ہوتا ہے اور اسکا اجمالی تجزیہ میرے ذہن میں جو ردِ عمل اختیار کرتا ہے وہ بہت زیادہ اطمیان بخش نہیں ہے۔ لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ جدید نظم اور زبان وادب کے اردو دیگر ہندوستانی زبانوں کے تناظر میں اپنا منفرد مستحکم مقام قائم کر چکی ہے لیکن اسکے تر دیدی امکان وآفاق حال انسانی صورت حال کے تمام تر پہلوں کے ساتھ براہ راست وابستہ ہیں اقداری زوال اندام ی دہشت گردی کی عالمی فردانی اور عامیانہ خودسر کزیت کے انتشار سے ہم سب ایک بحران سے گذرر ہے ہیں اس عصری منظر نامے میں انسانی بقاء کی واحد امید انسانی جزیروں کا استحکام اور فروغ ہے۔

بلراج کومل ۱ پنے ایک مضمون میں اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''جدید اردو نظم بھی میرے نزدیک مختلف انسانی جزیروں

---

۷۰ ''ایک مضمون'' بلراج کومل

میں سے ایک سرسبز جزیرہ ہے اسکا استحکام میں اس آواز
میں کرنا چاہتا ہوں جو میری آواز ہے ممکن ہے آپکی بھی ہو
..................اسلئے آج جدید اردو نظم کے امکان و آفاق
کے تلاش کے، اس موقع پر میں اپنے آپ سب دوستوں
میں سے ہر اک سے اس علامت میں زبان میں اس گفتگو کرنا
چاہتا ہوں۔'' ۱ے

''وہ جو چلتے ہوئے راہ میں منجمد ہو گئے
گرمئی لمس کے حسن اعجاز سے
انکو ایک بار پھر آج سیال کر
انکو یخ بستگی کے سلاسل سے آزاد کر
وہ جو تازہ قدم ہیں انھیں لے کے چل
بھسم ہونا ہے تجھکو سلگتی ہوئی آگ میں ایک دن
اس سے پہلے یہیں

....

سب خرابوں کو آباد کر
دور نزدیک
زندہ روشن
فلک بوس
اور خواب قامت
الاؤ سجا

ا ''ایک نظم''، بلراج کومل

موت سے قبل جینے کے نسخے کھرے
آگ کے اولہانہ دوارفتہ اندز میں آج جی
آگ کے جشن میں
آگ کا رقص کر
آگ کا گیت گا''[۱]

بلراج کومل کی اسی نظم میں ایک انتشاری کیفیت ہے جو عصر حاضر کی شناخت بن چکی ہے اس پر جوش اعلان میں مستور شاعرانہ اہلیت کی متین آوازیں پوشیدہ ہیں یعنی خطاب مکالے اور خود کلامی جدید اردو نظم میں ان تینوں آوازوں کی بازگشت جاری وساری نظر آتی ہے اور امکانات وآفاقات اسے جن لامحدود مقامات تک لے جاتے ہیں وہ سطحی نہیں ہوتے بلکہ میعاری ہوتے ہیں:-

مختصر یہ کہ موجودہ عہد کے معاشرتی انتشار روحانی بحران اور مستقبل کی نا آسودگی کے احساس اور مستقبل پر مسلط ان کے سایوں کے خوف نے شعراء کو اپنے ماضی کی طرف مراجعت کرنے پر مجبور کر دیا ہے ماضی کی طرف لوٹنے کی ایک صورت تو وہ ہے جو بازیافت عقیدہ کی شکل میں عادل منصوری کی نظموں میں ملتی ہے حالانکہ وہ خود اس رجحان کی توسیع نہیں کر سکے دوسری صورت ہیں متروک اسالیب کی جستجو سے عبارت ہے جو تقریباً فراموش کردہ ہیں شمس الرحمٰن فاروقی کی بعض نظمیں اسی ضمن میں آتی ہیں کمار پاشی کی شعری تکنیک نہایت سلیس اور پیچیدگی سے پاک ہے اسطور سازی کی دوسری مثال باقر مہدی زبیر رضوی وغیرہ کے یہاں دکھائی دیتی ہے کمار پاشی نے وقت کو مسلسل نہیں دیکھا ہے جبکہ زبیر رضوی ماضی کو دوبارہ زندہ کر کے اسکی بار یوشی کی ہے خلیل الرحمٰن کی بیشتر نظموں کا سباق بھی اسی نوعیت کا ہے انتہائی مانوس اور مخلص جذبوں کو لب گفتار عطا کرنے کے باعث یہ ہمارے دلوں کو چھو لیتی ہیں

عہد حاضر میں جن شعراء نے اپنی انفرادیت کی طرف توجہ دلائی ان میں سے صلاح الدین پرویز انیسؔ ناگی منیب الرحمٰن حمید الیاسؔ زاہدہ زیدیؔ ساقیؔ فاروقی کے نام نمایاں ہیں ان حضرات کی سفری تجربات کی خاصی طویل فہرست ہے انکی نظموں میں داخلی سوگواری روحانی بے چینی اور جنسی آسودگی اور نا آسودگی جیسے جذبات کے اظہار کی صورت نمایاں ہے آدائیگی کی زبان بھی بڑی حساس اور سکوت آمیز ہے۔

انکے علاوہ بھی چند نام ایسے ہیں جنکا کلام خصوصی توجہ چاہتا ہے جیسے عنبر بہرائچی کشور ناہیدؔ بلقیس ظفر الحسنؔ رفعیہ شیم عابدیؔ شہریارؔ مظہر امام اور شائستہ یوسف انکے کلام میں ہئیتی اور تکنیکی نظموں میں بڑی تازہ کاری ہے بہر کیفیت ان سبھی شعراء کے فکری شعور کی ارتقاء اور ذہنی شعور کی تشکیل میں گذشتہ بیس سالوں میں ابھرنے والے ناموں کا بڑا تعاون ہے روایات کو توڑنے کا حوصلہ اور پھر نئی روایات سے جدید رشتے قائم کرنے کا عزم بھی انھیں کی عنایت کردہ ہے۔ جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت اس حقیقت کا عرفان ہے کہ اب ہمیں جدید ترین قدریں تلاش کرنی ہیں اس سطحی زندگی کو نئے مفاہیم نئے معنی دینا اسے نئے رشتوں سے وابستہ کرنا نئی بستیاں بسانا روح کی بھوک مٹانے کیلئے نئی کہانیاں تلاش کرنا آج کی اہم ضرورت ہے اسکی پاسداری کیلئے اپنے نظریات میں حددرجہ وسعت لانی ہے عہد حاضر کے شعراء کو بند کمروں سے نکل کر بالائی منزلوں سے اتر کر اپنے قاری کی تعداد بڑھانی ہوگی اسکا ادبی ذوق سنوارنا ہوگا اظہار و بیان و ادب کے کون سے سانچے حذف ہو چکے ہیں اسپر غیر جذباتی انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے جو نظم جدید کے مستقبل کو تابناک بنانے میں کافی اہم رول ادا کرسکتی ہے۔

آخر میں اس خطرے کی جانب اشارہ ضروری ہے کہ ہماری نسل ایک ایسی سرنگ میں دوڑ رہی ہے جسکا رقبہ بہت ہی کم ہے منفی اور مادی ترقی نے اسے نیوکلیائی تباہی کے ڈھلانوں سے قریب کردیا ہے۔ اگر ہم اس سرنگ سے صحیح سلامت نکل بھی آئے تو ایک ایسی

وادی میں پہنچ رہے ہیں جہاں ہر شے نٹ ورک اور انٹرنیٹ کی تابع ہے کمپیوٹر ئیلی کام سافٹ ویر
اورای کام کی اس دنیا میں کیا پرنٹ میڈیا اپنا تحفظ کر سکے گا ؟ اور اگر نہیں تو کیا ادب پرنٹ میڈیا
کے بغیر زندہ رہ سکے گا ہمیں ان سوالات کے غور وخوض کے ساتھ اردو ادب کی ارتقاء و بقاء میں
تعاون کے ساتھ دعائیں بھی کرنی ہونگی۔

کتابیات

(الف)

	کتاب	مصنف / ناشر
(۱)	افکار ملی	کوثر خطیری جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۲)	اردو کی ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ	منظر اعظمی
(۳)	ادب کی تلاش	بلراج کومل نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۵ء
(۴)	اردو شاعری کا مزاج	وزیر آغا
(۵)	آجکل	اخترالایمان اور نظم کا قاری خلیل الرحمٰن اعظمی
(۶)	ادب کی باتیں	انیس اشفاق نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۹۴ء
(۷)	اردو شاعری میں انسان روشنی	ڈاکٹر فاطمہ تنویر بھارت آفسیٹ دہلی
(۸)	اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو	ڈاکٹر مصطفٰے صباحی دہلی پبلشر
(۹)	اردو نظم	اردو اکاڈمی دہلی ثمر آفسیٹ پریس ۱۹۹۵ء
(۱۰)	اردو ادب کو خواتین کی دین	اردو اکاڈمی دہلی ۱۹۹۴ء
(۱۱)	آزادی کے بعد اردو نظم	ڈاکٹر عتیق اللہ اردو اکاڈمی ۱۹۹۲ء
(۱۲)	اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبدالعلیم مرتبہ شہریار
(۱۳)	'انتخاب کلام'	خلیل الرحمٰن اعظمی اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ
(۱۴)	اردو میں ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی ایجوکشن بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۱ء
(۱۵)	اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	ڈاکٹر محمد حسن نئی دہلی ۱۹۷۹ء
(۱۶)	ادب اور وابستگی	ڈاکٹر سید عبدالباری نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد ۱۹۶۴ء
(۱۷)	اخترالایمان مراجعت کی ایک مثال	وزیر آغا ایجوکیشن ہاؤس ۱۹۸۲ء]

(ب)

(۱۸) بند ہوتا ہوا بازار	مظہر امام اے ون آفسیٹ نئی دہلی ۱۹۹۲ء
(۱۹) تنقیدی کشمکش	باقر مہدی

(ت)

(۲۰) تعارف	
(۲۱) توازن ادب اور زندگی	خلیل الرحمٰن اعظمی

(ج)

(۲۲) جدیدیت اور ادب	آل احمد سرور
(۲۳) جدید اردو نظم نظریۂ و عمل	ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی ایم اے پرنٹرس ۱۹۹۰ء
(۲۴) جادۂ شب	سید امین اشرف عضیف پرنٹرس ۲۰۰۰ء
(۲۵) جدید شاعری	ڈاکٹر عبارت بریلوی ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۳ء
(۲۶) جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	شمیم حنفی مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۷۸ء
(۲۷) جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات	علی حماد نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد ۱۹۹۲ء
	خلیل الرحمٰن اعظمی
(۲۹) جدید ترین غزل ''مضامین نو''	مرتبہ مغنی تبسم و شہریار موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۱ء
(۳۰) جدیدیت کیا ہے راشد شخصیت فن	خلیل الرحمٰن اعظمی
(۳۱) راشد کا ذہنی ارتقاء رادار	ساقی فاروقی لبرٹی پریس نئی دہلی ۹۸۲ء

(س)

(۳۲) ساقی	حسن عسکری

(ش)

(۳۳) شعور	محمد ہاشمی ۱۹۷۸ء
(۳۴) شعر غیر شعراء اور نثر	شمس الرحمٰن فاروقی

(ف)

(۳۵) فاروقی کے تبصرے — شمس الرحمٰن فاروقی
(۳۶) فلسفہ اور ادبی تنقید — ڈاکٹر وحید اختر

(ق)

(۳۸) قندیل — قیوم نظر
(۳۹) قاری اساس تنقید — گوپی چند نارنگ چودھری پریس دہلی ۱۹۹۲ء

(ک)

(۴۰) کچھ نئی شاعری کے بارے میں — خلیل الرحمٰن اعظمی سالنامہ کتاب گھر لکھنؤ
(۴۱) کتاب نما — انیس ناگی دہلی

(گ)

(۴۲) گل دتر پیش لفظ — مخدوم محی الدین
(۴۳) گلۂ صفورا — شفیق فاطمہ شعریٰ ۱۹۹۰ء

(ل)

(۴۴) لسانی تشکیلات نئی شاعری — افتخار جالب

(م)

(۴۵) مضامین نو — خلیل الرحمٰن اعظمی
(۴۶) مجاز شخصیت سوانح اور شاعری — محمد حسین شکوہ علی گڑھ پریس
(۴۷) مضامین نو نئے شعری رجحانات — خلیل الرحمٰن اعظمی
(۴۹) میراجی دھرتی پوجا کی ایک مثال — وزیر آغا

(ن)

(۵۰) نئی شاعری ایک امتحان — شمس الرحمٰن فاروقی شب خون کتاب گھر ۱۹۶۸ء الہ آباد
(۵۱) نظم جدید کی کروٹیں — وزیر آغا اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۶ء
(۵۲) نئے اور پرانے چراغ — آل احمد سرور حالی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۵ء

(۵۳) نیا دور — راشد کراچی پبلشنگ

(۵۴) نیا دور کیفی اعظمی نمبر — اردو اکاڈمی ۲۰۰۲ء

(۵۵) نئے شعری رجحانات

(۵۶) نئی شعری روایات — ڈاکٹر شمیم حنفی مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۷۸ء

(۵۷) نئی شعری غزل کا مزاج — فصیل جعفری

(۵۸) نئی شاعری کے چند مسائل — پروفیسر آل احمد سرور مکتبہ جامعہ نئی دہلی

(۵۹) نئی نظم کا سفر — مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی بڑٹی پریس دہلی ۱۹۸۲ء

(۶۰) نئی سمتوں کا شعور — ڈاکٹر خورشید سمیع خواجہ پریس دہلی ۱۹۹۴ء

مجموعۂ کلام

۱ :	'کالے کاغذ کی نظمیں' 'سیاہ سیاہ'	باقر مہدی
۲ :	'نجات سے پہلے'	قاضی سلیم
۳ :	'سنگ پیراہن شب گشت'	عمیق حنفی
۴ :	'آخری دن کی تلاش' 'خالی خالی مکان'	محمد علوی
۵ :	'بیاض شام نیم' 'خواب'	شاذ تمکنت
۶ :	'ہر ہر دریا ہے' 'پرانی بات ہے'	زبیر رضوی
۷ :	'چہار سمت دریا سبز اندر سبز کرچیں'	شمس الرحمٰن فاروقی
۸ :	'لفظوں کا پل'	ندا فاضلی
۹ :	'جوئے نغمہ' 'آتش زیر پا'	ساجدہ زیدی
۱۰ :	''ساتواں در' 'ہجر کے موسم'	شہریار
۱۱ :	'رشتہ گونگے سفر کا' 'بند ہوتا ہوا بازار'	مظہر امام
۱۲ :	'رائیگاں'	بشیر نواز
۱۳ :	'گیلا ایندھن'	بلقیس ظفیر الحسن
۱۴ :	'سراب در سراب' 'موج ریگ'	پرتپال سنگھ بیتاب
۱۵ :	'صحرا صحرا'	رؤف خلش
۱۶ :	'موسم بھیگی آنکھوں کا'	رفیعہ شبنم عابدی
۱۷ :	'روشنی کہاں سے کالی ہے'	فضل تابش
۱۸ :	'گلۂ صفورا'	شفیق فاطمہ شعریٰ

ڈائجسٹ رسائل واخبار

۱ :	سہ ماہی	'ذہن جدید'	جون تا نومبر' دسمبر تا فروری' مارچ تا مئی ۱۹۹۶ء
۲ :	سہ ماہی	//	خصوصی گوشہ مارچ تا اگست ۱۹۹۶ء ستمبر ۹۹ تا فروری
۳ :	سہ ماہی	//	مارچ تا اگست ۲۰۰۲ء مارچ تا اگست ۲۰۰۱ء دہلی
۴ :	سہ ماہی	'گفتگو'	
۵ :	سہ ماہی	'ادیب'	جنوری تا دسمبر ۱۹۹۶ء جامعہ اردو علی گڑھ
۶ :	نیادور		جولائی اگست کیفی اعظمی نمبر یونائیٹڈ بلاک لکھنؤ
۷ :	ماہنامہ	'ہما'	شاعر انقلاب نمبر دہلی ۱۹۸۲ء
۸ :		'معارف'	مارچ اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء
۹ :	ماہنامہ	'شب خون'	اگست ۹۳' مارچ ۹۴' نومبر ۹۵' جنوری ۹۸' اپریل ۹۸' اگست ستمبر ۹۸' جولائی ۹۹' اکتوبر ۹۹' نومبر ۹۹' مارچ تا مئی ۲۰۰۰ء' فروری ۲۰۰۱ء' اکتوبر ۲۰۰۱ء وغیرہ

(1) Dictionery of Philospgy I Folow.

(2) Human & Social Pathology by Barbare Wotten.

(Human Frame , Julian Huxley)

(3) The way to Humanism (Radha Kumud

Mukarjee